ضیا کی غزلوں کے چند ایسے اشعار جن میں اُن کے نظریۂ شاعری اور عصری شعری تجربات کے تعلق سے اُن کے جذبات و خیالات کی نشاندہی ہوتی ہے درج ذیل ہیں - اُنہی کو اس مجموعۂ غزلیات کا دیباچہ سمجھنا چاہیئے -

جگدیش بھٹناگر حیات

کرتی ہے اشاروں میں باتیں
کہتے ہیں ضیا ہم جس کو غزل

دل میں جلووں کا اُترنا ہے نزولِ اشعار
آنکھ سے اُٹھتے ہیں پردے تو غزل ہوتی ہے

رگِ احساس مضرابِ جنوں نے چھیڑی ہوگی
ہوا ہوگا لہو دل تو غزل میں نے کہی ہوگی

غزل کہنے سے ڈرتا ہوں غزل کا کام کیا جب تک
مرا ہر شعر تیرے درد کا حامل نہ بن جائے

اُن تک غزل کے روپ میں پہنچا رہا ہوں میں
پیغام دے گئی ہے جو بادِ صبا مجھے

حاملِ حسنِ قدامت ہے مرا رنگِ غزل
داستانیں شمع و پروانہ کی دہراتا ہوں میں

روایتی پیکرِ غزل میں بھرا ہے رنگِ جدید میں نے
ضیا مرے شعر میں مہیا کوئی نئی بات ہی ملے گی

جدت کہ قدامت مجھے کیا فکر، مرا شعر
بیگانۂ مفہوم و معانی تو نہیں ہے

وہ قدامت ہو، ترقی ہو کہ جدت کچھ ہو
لہجہ ہر شعرِ غزل میں ہے ضیا کا اپنا

اے ضیا ترکِ روایت تو ہے جدت لیکن
کشتِ جدت میں اُگ آئی ہیں روایات نئی

اُن سے امیدِ دادِ غزل کس لئے ضیا
یہ شاعری ہے آج کی نا شاعری نہیں

گھٹا بڑھا کے بھی دیکھا مگر نہ بات بنی
غزل کا روپ روایت پسند ہے یارو

ضیا اپنے اشعار سے زندگی میں
نیا حسن پیدا کیا چاہتا ہوں



نبردِ آزما ہے اندھیروں سے دنیا
ضیا کی غزل ہی کوئی اب سنا دو

شاعرِ رنگ و نور ہوں، حسن سے مجھ کو کام ہے
پھول ہیں مجھ سے ہم سخن، چاند بھی ہمکلام ہے

دیکھنے کی شے بنی پھر گرمیٔ بازارِ شعر
طبع ہو کر آ گیا ہے کس کا دیوانِ غزل



نوٹ:- صفحہ ۱۱ سطر ۱۲ مطلع کی جگہ مقطع پڑھیے —



لب پہ آئی غزل برائے غزل
ہم سخن کون ہے سوائے غزل

ذرّہ ذرّہ دکھائے جلوۂ طور
غنچہ غنچہ مجھے سُنائے غزل

کہہ رہا ہوں جو آج ، کل شاید
اُن کی محفل میں بار پائے غزل

سازِ دل چھیڑ دو کہ ماہ تمام
رقص میں آئے اور گائے غزل

روزِ روشن میں گرمیاں بھر دے
اور شب میں دئے جلائے غزل

رُکتی ، چھُپتی ، لجاتی ، جیسے دُلہن
خلوتِ ذہن میں در آئے غزل

اے ضیاؔ دل کو دے پیام درنہ
حُسن کو آئینہ دکھائے غزل

(بمبئی دسمبر ۱۹۶۷ء)



مُجھ پہ جب ہو گی تری چشمِ کرم جانِ غزل
دیکھ لُوں گا صُورتِ تکمیلِ سامانِ غزل

اہلِ دل کو کیوں نہ کر لے دامِ گیسو کا اسیر
لعبتِ اُردو کہ ہے خود صیدِ پیکانِ غزل

چاکِ دامانِ غزل سے پھوٹی سورج کی کرن
اور اب کیا چاہیے تجھ کو ثنا خوانِ غزل

جب بنا لے برق شاخِ گُل پہ اپنا آشیاں
چھیڑ دے اُس وقت کوئی سازِ عرفانِ غزل

یہ فسونِ کیف و مستی یہ طلسمِ حُسن و عشق
یہ نمودِ رنگ و نکہت زیرِ دامانِ غزل

میر و سودا، ذوق و غالب، مومن و داغ و امیر
محسنِ اُردو ہیں سب اُن پر ہے احسانِ غزل

نظم نے پھیلا دیے دامِ افادیت مگر
اے ضیاؔ، ہے روز افزوں آج بھی شانِ غزل

(نئی دہلی مارچ ۱۹۷۹ء)



آشاؤں کا سورج نکلا خوابیدہ انساں جاگے گا
عزم و عمل کے بُت خانوں سے عفریتِ ظُلمت بھاگے گا
ظلم کی زنجیریں ٹوٹیں گی جشن منائے گی آزادی
عشق و وفا کا پاک نازک جذبہ پھر دل میں جاگے گا
ایسے موڑ پہ آپہنچا ہے چلتے چلتے آج مسافر
پیار کی جوت جگا کر دل میں نفرت کی اگنی تیاگے گا
رات کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں صبح کھڑی کچھ سوچ رہی ہے
کھا کر طوفانوں کے تھپیڑے کب مظلوم انساں جاگے گا
آدم کو معلوم نہ ہو گا اُس کا پیارا بیٹا اک دن
جنّت کی موہوم اُمیدیں اپنا کر دُنیا تیاگے گا
منزل تو ہے تیز رووں کی ٹھوکر کھانے سے کیا ڈرنا
محکم عزم مسافر ہی تو گر کے اُٹھے گا اور بھاگے گا
تاریکی سے ضیا یہ کہہ دو جو شمعیں روشن ہونگی
دل نے گھر میں آگ لگائی آگ سے ڈر کر کیا بھاگے گا



اجنبی دُنیا میں میرا آشنا میں ہی تو تھا

دی سزا اُس کو نے جسے، وہ بے خطا میں ہی تو تھا

میں جو ٹوٹا، ہوگیا ہنگامۂ محشر بپا

تارِ سازِ بے صدا و بے نوا میں ہی تو تھا

ناخدا و موجِ طوفاں کی شکایت کیا کروں

جس نے خود کشتی ڈبو دی۔ اے خدا میں ہی تو تھا

اُس کو باہر لا کے رسوا کر دیا بازار میں

جو مجھے اندر سے دیتا تھا صدا میں ہی تو تھا

ہوگیا مسرورِ نجّت اپنی انا کا توڑ کر

درمیانِ ما و تو اِک فاصلہ بیچا تو تھا

تاابد کرنا پڑے گا صبحِ نو کا انتظار

منتظر روزِ ازل سے شام کا میں ہی تو تھا

تھا خفیا احساسِ تنہائی بھری محفل میں بھی

مجھ میں بیارہ کرہ بھی جدا جو تھا مرا میں ہی تو تھا

(نئی دہلی جون ۱۹۷۹ء)



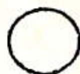
اشک پلکوں پہ پھر سجاؤں کیا؟
پھر محبت کے گیت گاؤں کیا؟
دل ہی جب بجھ گیا تو اے شبِ غم
آندھیوں میں دیئے جلاؤں کیا؟
آفتیں ہیں تو زندگی بھی ہے
آفتوں سے نجات پاؤں کیا؟
رازدارِ الم، شریکِ غم
در و دیوار کو بناؤں کیا؟
تیرہ و تار ہے مری دُنیا
مہر و مہ کا فریب کھاؤں کیا؟
لاکھ پردے، ہزار چہرے ہیں۔
آپ کو اپنے سے چھپاؤں کیا؟
یہی نقطہ ہے نکتۂ ہستی
اے ضیا، اب نظر ہٹاؤں کیا؟

(شمع دہلی نومبر ۱۹۷۹ء)



اے دلِ ناداں، شور و شغب کیا
مجھ کو نہیں ہے پاسِ ادب کیا
بگڑی ہوئی ہے میری ہی قسمت
سویا ہوا ہے میرا ہی رب کیا
دُور ہے منزل، راہ بھی مُشکل
سہل پسندی، ہائے طلب کیا
نغمہ سرا کیا بادِ بہاری
گوشۂ زنداں نالہ طلب کیا
ساقیٔ دوراں، مُردہ دلوں کو
نُورِ سحر کیا، ظُلمتِ شب کیا
چاند ستارے ہیں گردش میں
کس کو خبر ہے ہو جائے کب کیا
حُسن سے عاری، کیف سے خالی
شعر ضیا ہو، داد طلب کیا

(نئی دہلی ۱۹۶۲ء)



پھر مرے لب پہ ترا نام آیا
پھر مرا دردِ جگر کام آیا

ہائے وہ رند جو میخانے سے
تشنۂ بادۂ گلفام آیا

اُسے عقبیٰ سے ہے اُمیدِ سکوں
جسے دُنیا میں نہ آرام آیا

ترکِ سجدہ کا نتیجہ معلوم
مَیں ترے در سے تو ناکام آیا

بات جب اُن کے تغافل کی چلی
دل کے افسانے کا انجام آیا

حُسن سے کون ملاتا آنکھیں
میرے سر عشق کا الزام آیا

اے ضیاؔ بزمِ طرب میں کوئی
خُوگرِ حسرت و آلام آیا



تقدیر کو تو تدبیر بنا، تدبیر سے تو تقدیر بنا
تعبیر پہ رکھ خوابوں کی بنا، ہر خواب کو اک تعبیر بنا

بدنام محبت ہوتی ہے، کیوں حسن کو رسوا کرتا ہے
یا حرفِ شکایت لب پہ نہ لا، یا آہ کو پُر تاثیر بنا

یہ باتیں تو ہیں فرشتوں کی، رہ جائے نہ کوئی ان باتوں پر
وہ انساں، انساں کیا ہوگا جو انساں بے تقصیر بنا

صورت صورت میں جھلکی ہیں، دل میں تو کوئی فرق نہیں
دیکھے جو وہ اپنی ہی سمجھے ایسی بھی کوئی تصویر بنا

گیت آزادی کے گاتا ہے، پرچم بن کر لہراتا ہے
وہ دل جسے زندانی سمجھے، وہ گیسو جو زنجیر بنا

صد چاک جگر ہوتا ہے تو ہو، ہنسنے سے گلوں کو مطلب ہے
رونے کا تو حاصل کچھ بھی نہیں، شبنم سے نہ تو تقدیر بنا

یہ رازِ محبت کھلتا ہے ضیا، کھلتے کھلتے ہی کھلتا ہے
وہ درد ہے خود اپنا درماں، الجھا کے جو دل کی پیر بنا

(بمبئی جنوری ۱۹۶۷ء)



تیرے سودائی نے کیا زخمِ جگر دیکھ لیا
محورِ گردشِ خورشید و قمر دیکھ لیا

ختم ہوتے ہی شبِ غم، ہوئی تو بھی خاموش
ساتھ جلتا ترا اے شمعِ سحر دیکھ لیا

جادۂ منزلِ مقصود کی سازش تو یہ
پاؤں اُٹھا نہ تھا کہ، انجامِ سفر دیکھ لیا

تابِ دیدار کا اب دعویٰ کروں یا نہ کروں
تیرے جلووں نے مرا حُسنِ نظر دیکھ لیا

دیکھتے دیکھتے کھل جائے گی تقدیرِ جمال
اُس نے سوتے میں اگر جانبِ در دیکھ لیا

ہم نے آئینہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا خود کو
دیکھنے والوں نے دنیا کو مگر دیکھ لیا

اے ضیاؔ یوں بھی ہوا، ہم نے اُٹھا کر اکثر
اپنا افسانہ بہ عنوانِ دگر دیکھ لیا

(نئی دہلی ۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء)



چارہ گر! کیا مرے زخموں کا مداوا ہوگا
درد اپنا جو نہ ہوگا تو پرایا ہوگا

آپ اور مجھ پہ ترس کھائیں، یہ کیا بات ہوئی
سچ کہا ہے مَیں نے کوئی خواب ہی دیکھا ہوگا

پردہ اُٹھا تو مری تابِ تماشا بھی گئی
لب کُشائی کا مجھے حوصلہ اب کیا ہوگا

لے کے آیا تھا تری بزم میں دل کی سوغات
کیا خبر تھی کہ یہاں غم کا تماشا ہوگا

شب گزیدہ دل کو ڈراتی ہے یہ کہہ کر دنیا
صبح ہوگی تو اُجالا ہی اُجالا ہوگا

حُسن بازار میں آپہنچا ہے اب تو اے دل
کوئی پردہ نہ رہے گا یہی پردہ ہوگا

دل کی دھڑکن بھی سُنائی نہیں دیتی ہے یہاں
سبھی خاموش ہیں، یہ شہرِ صمد کیا ہوگا

(نئی دہلی اپریل ۱۹۶۸ء)



چاہا جسے، اُسی نے نظر سے گرا دیا
دُنیا نے خوب میری وفا کا صِلا دیا
ظلمت کی آندھیوں میں جلایا تھا جو چراغ
اے بادِ صبح تو نے اُسے بھی بُجھا دیا
آ ہی گیا ہے بخت کی کوتاہیوں کا ذکر
اب کیا بتاؤں مجھ کو تمنا نے کیا دیا!
جانِ بہار ہے وہی غنچہ جو باغ میں
دو دِن کے واسطے ہی سہی، مُسکرا دیا
فرہاد اب کہاں ہے کہ پتھّر کو کاٹ کر
آئی جو موج، شیر کا دریا بہا دیا
غم ہائے روزگار کی تھی دھوپ کتنی تیز
سائے نے تیری یاد کے جب آسرا دیا
منزل سے کیوں عزیز نہ رکھوں اُسے بھلا
دُشوار رہگزر نے مجھے حوصلہ دیا

(بمبئی اکتوبر ۱۹۶۶ء)



حسرتوں کو گلے لگاؤں کیا؟
دل ہے روٹھا ہوا مناؤں کیا؟
اپنے در کو نہ آزماؤں کیا؟
تیرے در پر جبیں جھکاؤں کیا؟
پوچھتا ہے بہار سے غنچہ
ایک دو پل کو مسکراؤں کیا؟
تو سراپا غزل ہے جانِ غزل
تجھے اپنی غزل سناؤں کیا؟
آنکھ میں آنکھ ڈال کر جو تو
زہر بھی دے تو پی نہ جاؤں کیا؟
رہوں مدہوش عشق میں تجھ کو
ہوش میں آؤں یا نہ آؤں کیا؟
دل نے چاہا تو تقاضا لیکن
بارِ غم ہے گراں، اٹھاؤں کیا؟
(۱۰ نومبر ۱۹۷۹ء)



خلوص و وفا کا صلہ پائیے گا
ہجومِ تمنّا میں کھو جائیے گا

دبے جائیے گا غم کہاں تک زمانہ
کہاں تک زمانے کا غم کھائیے گا

جسے دیکھیئے گا سبق ڈوبنے کا
اُسے قطرے قطرے کو ترسائیے گا

اندھیروں سے دامن چھڑا لیجئے لیکن
اُجالوں سے بچ کر کہاں جائیے گا

بڑھائے چلا جا رہا ہوں پتنگیں
نہ کب تک مرے ہاتھ آ پائیے گا

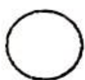
اُدھر حور و کوثر، اِدھر جام و ساقی
کسے کھوئیے گا کسے پائیے گا

سحر نے ربابِ رگِ غنچہ چھیڑا
صبا کی غزل اب کوئی گائیے گا

(نئی دہلی فروری ۱۹۶۹ء)



خود شوق محبّت کو ہے شوریدہ سری کا
الزام مگر حُسن پہ ہے عشوہ گری کا
کیا سوچ کے دامن کو عنادل نے کیا چاک
پھولوں میں تو دستور ہی تھا جامہ دری کا
دیکھا تجھے غش کھا کے گرا ہوش میں آیا
کیا ہوگا ثبوت اور مری دیدہ وری کا
اے دل لبِ گویا سے تو ممکن ہی نہیں تھا
جو کام نگاہوں نے کیا نامہ بری کا
یہ نشۂ عرفاں ہے، نہیں نشۂ بادہ
کچھ اور ہی عالم ہے مری بیخبری کا
رکھتا ہوں نشیمن میں بھی آدابِ قفس یاد
شکوہ نہیں صیاد سے بے بال پری کا
دہلیز پہ وہ چھوڑ گیا ہے کئی منظر
آیا تھا فنیا جھونکا نسیمِ سحری کا



خوگرِ درد کو آمادۂ فریاد کیا
تُو نے کیا کارِ نمایاں ستم ایجاد کیا

غمِ جاناں کو دُعا دیتا ہوں جس نے مجھ کو
شورش و کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

شِیر کی نہر ملی ، حسرتِ شیریں نہ گئی
کوہ کاٹا بھی تو کیا تیشۂ فرہاد کیا؟

بھُول جانا تھا ہمیں بھُول گئے تُم ہم کو
یاد کرنا تھا تمہیں ، ہم نے تمہیں یاد کیا

گُل کھلا کر تو بہت خوش ہیں بہاریں لیکن
کِسی اُجڑی ہوئی بستی کو بھی آباد کیا؟

یہ وہی دھرتی ہے کہ جو ہم کو برباد
یہ وہی دھرتی ہے ہم نے جسے آباد کیا

میں اندھیروں میں بہر طور ضیا بن کے رہا
اپنے سائے کو نہ خود سے کبھی آزاد کیا



(نئی دہلی اکتوبر ۱۹۸۰ء)



خوئے بلبل کو نغمہ جو دیکھا
گُل کو محرومِ رنگ و بو دیکھا

ایک میرا ہی جام کیوں ہے تہی
بادہ بادہ، سبو سبو دیکھا

اپنے سجدوں کو تیرے جلووں کو
در بدر دیکھا، کو بہ کو دیکھا

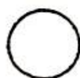
موڑ کر روشنی سے منہ اپنا
اپنے سائے کو روبرو دیکھا

اک خموشی کا پُرسکوں عالم
پسِ دیوار ہاؤ ہو دیکھا

یہ بھی تھا اپنی ہی نظر کا فریب
دوست کے بھیس میں عدو دیکھا

کہیں اپنا پتا ملا نہ صبا
دیکھنے کو تو چارسُو دیکھا

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء)



دل جل رہا تھا جیسے کسی قبر کا دیا
آندھی نے حادثات کی آ کر بجھا دیا

زحمت نہ دی زباں کو مگر واہ رے جنوں
چپ رہ کے میں نے حالِ دل اُن کو سنا دیا

موجود اور بھی تھے تری بزمِ ناز میں
لیکن مجھی کو تو نے غمِ بے دوا دیا

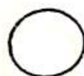
کیوں چھین لی نہ تابِ نظر بھی نگاہ سے
دل کو تو بے نیازِ تمنّا بنا دیا

دستک درِ حیات پہ دی کس نے صبحدم
تھا محوِ خوابِ ناز، مجھے کیوں جگا دیا

اس باغ میں تو پھولنا پھلنا محال ہے
جس شاخ پہ پھل آیا اسی کو جھکا دیا

دستورِ زندگی ہے ازل سے یہی خبیا
مرجھا گیا تو ٹہنی سے پتّہ گرا دیا

(نئی دہلی جولائی ۱۹۷۳ء)



دل میں جو نشتر تھا، وہ میں ہی تو تھا
اشک پلکوں پر تھا، وہ میں ہی تو تھا
لعل تھا، پتّھر تھا، وہ میں ہی تو تھا
رہگزر تھا، گھر تھا، وہ میں ہی تو تھا
رات کی آغوش میں مسلا ہوا
پُر شکن بستر تھا، وہ میں ہی تو تھا
کارزارِ زندگی، جس کے لئے
عرصۂ محشر تھا، وہ میں ہی تو تھا
کہتے ہیں، اک غم گزیدہ آدمی
درد کا خوگر تھا، وہ میں ہی تو تھا
خود کو خود میں کھو کر آخر پا لیا
جو مرا دلبر تھا، وہ میں ہی تو تھا
اب مجھے کچھ بھی کہے دنیا ضیا
رہزن و رہبر تھا، وہ میں ہی تو تھا

(نئی دہلی مئی ۱۹۷۹ء)



دُھوپ کے نیچے سے مُشکل ہے نکلنا اپنا
سایہ سایہ کیا کرتا ہے وہ پیچھا اپنا

پی نگا ہوں سے کہ ہاتھوں سے نہیں کچھ معلوم
جہاں ساقی تھا وہاں ہوش کسے تھا اپنا

جستجو اپنی ہی تھی روزِ ازل سے ہم کو
بستی بستی لئے پھرتا رہا سودا اپنا

بس گیا چپکے سے آ کر مرے دل میں کل شب
وہ پرایا جسے ہر شخص نے سمجھا اپنا

پڑ گیا عکس کسی پیکرِ نادیدہ کا
آئینہ دیکھ کے حیراں ہے سراپا اپنا

فصلِ گُل آئی تو گلشن میں بکھر جائیں گے
ہمیں معلوم ہے انجام جو ہوگا اپناہ

وہ قدامت ہو، ترقی ہو کہ جدّت کچھ ہو
لہجہ ہر شعرِ غزل میں ہے ضیا کا اپنا

(نئی دہلی اپریل ۱۹۸۰ء)



رنگ ہستی میں بھرا میں نے مئے گلفام کا
کیوں نہ ہو چرچا دو عالم میں مرے پیغام کا
کیا کرے ماتم کوئی مرگِ دلِ ناکام کا
زندگی تو اک نتیجہ ہے خیالِ خام کا
جھمگھٹا کالی گھٹاؤں کا فلک پر دیکھ کر
پھر گیا آنکھوں میں منظر میکدے کی شام کا
پردہ در پردہ ترا جلوہ ہے میں کب تک یونہی
جال پھیلائے ہوئے بیٹھا رہوں اوہام کا
دیکھنے کو مل تو جاتی ہے تری صورت مگر
جو نہ پہچانے مجھے وہ آئینہ کس کام کا
کون کر سکتا تھا راون کے سوا سیتا ہرن
لے لیا بن باس، کتنا حوصلہ تھا رام کا
جس قدر عیش و طرب کا زندگی میں ہے ضیا
اُس سے کچھ بڑھ چڑھ کے حصّہ ہے غم و آلام کا

(نئی دہلی جون ۱۹۷۹ء)



زمانے کے ستم کیا اور کرم کیا؟
دلِ ناداں یہ فکرِ بیش و کم کیا؟
خم و پیچِ رہِ ہستی سلامت
کسی زلفِ سیہ کے پیچ و خم کیا؟
شبِ غم کے اندھیرے ہو چلے گہرے
کوئی سورج نہ لے گا اب جنم کیا؟
برس کر ہو گئیں رخصت گھٹائیں
نہیں اب غم تو پھر احساسِ غم کیا؟
کیا مصلوب، سولی پر چڑھایا
چلا تھا راہِ حق میں دو قدم کیا؟
پلا دے ساقیا جا ہے جو مجھ کو
نہیں معلوم کیا وہسکی ہے رم کیا؟
قدامت اور جدت، شرق و مغرب
ضیا ہوں گے کبھی دونوں بہم کیا؟

(نئی دہلی جولائی ۱۹۶۴ء)



زندگی کے لئے موت سے ڈر گیا
نامُراد آدمی جیتے جی مر گیا
اے غمِ دوش کیسے مناؤں اُسے
وہ زمانہ جو مجھ سے بگڑ کر گیا
ابر برسے گا کیا اُس دلِ مرتا پر
جو محبّت کے انجام سے ڈر گیا
تھی کرامت کسی کے درِ ناز کی
سر گراں بھی تو ہو کے سبک سر گیا
رات کی بات اُس کے سوا کچھ نہیں
ہوش آیا ہمیں، وہ فسوں کر گیا
راس ظلمت شبِ غم کی آئی اُسے
جس کے دل میں ترا جلوہ گھر کر گیا
سرفرازی اُسی کو ملی اے ضیاؔ
ہو کے جو سرنگوں اُن کے در پر گیا

(زندوراس دسمبر ۱۹۵۵ء)



طور ٹھنڈا ہو گیا، کعبہ صنم خانہ ہوا
کون اپنا تھا، کیسے سمجھیں کہ بیگانہ ہوا

ذرّے ذرّے میں تجلّی تھی کسی کی بے حجاب
جتنا فرزانہ تھا کوئی، اتنا دیوانہ ہوا

یہ تماشا رات میخانے میں دیکھا ساقیا
توبہ ٹوٹی تھی کہ ٹکڑے ٹکڑے پیمانہ ہوا

راکھ ہونے کا نہیں غم، سوچتا ہوں اب کہ کیوں
راستے میں برق کے میرا ہی کاشانہ ہوا

اک نیا چہرہ لگا رکھا ہے چہرے پر مگر
جانتا ہوں تجھ کو، تو ہے میرا پہچانا ہوا

ہو نہ ہو کچھ ظلمتِ شب سے بھی نسبت تھی لیے
صبح سے پہلے جو جل کر راکھ پروانہ ہوا

ڈھونڈتے پھرتے ہیں خود کو جنگلوں صحراؤں میں
لے ضیا اپنا بھی کس ظالم سے یارانہ ہوا

(شمع دہلی جون ۱۹۷۹ء)



(بقیۂ یک قافیہ)

غمِ زیست سے دل مرا بُجھ گیا
جو تُم اُٹھ گئے تو دیا بُجھ گیا

گُھس آئیں دبے پاؤں پھر ظلمتیں
جلاتے ہی گھر کا دیا بُجھ گیا

بڑا زور اندھی ہواؤں کا تھا
نگاہوں کا جلتا دیا بُجھ گیا

ہوئیں ختم ماچس کی سب تیلیاں
جلے گا وہ کیا جو دیا بُجھ گیا

جلایا تھا دے کر جسے خونِ دل
چلیں آندھیاں، وہ دیا بُجھ گیا

سہاروں پہ جیتا ہے کب تک کوئی
ہوا تیل ختم اور دیا بُجھ گیا

قریبِ سحر ہی سہی اے ضیاؔ
اندھیروں کو مژدہ دیا بُجھ گیا

(نئی دہلی نومبر ۱۹۸۰)



کالے بازار کا اک سکّہ تھا کھوٹا کوّا
ہنس کی چال چلا کالا کلوٹا کوّا
دو قدم آگے ہے نیتاؤں سے بھی مکّاری میں
دیکھنے میں ہے مگر چیل سے چھوٹا کوّا
ایک بھی بوند ٹھہر پائی نہیں پانی کی
کچھ نہ پوچھو کہ ہے یہ بے پیندے کا لوٹا کوّا
صبح دیکھا تو وہی کوّا تھا دبلا پتلا
رات آیا تھا نظر خواب میں موٹا کوّا
کائیں کائیں سے تو پگھلی نہ کوئی بھی دیوار
چونچ میں اپنی لئے پھرتا ہے سوٹا کوّا
آج آیا نہیں مہمان تو کل آئے گا
اپنا جی کرتا ہے کس واسطے چھوٹا کوّا
اے ضیا رستم و سہراب بھی ڈر کر بھاگے
باندھ کر اترا جو میدان میں لنگوٹا کوّا

(نئی دہلی مارچ ۱۹۵۳ء)



کسی کو شود بغیرِ زباں نہیں ملتا
جلے نہ برق اگر آشیاں نہیں ملتا

ہجومِ یاس، شبِ تیرہ، دردِ تنہائی
سکوں کہاں، مجھے دل کا نشاں نہیں ملتا

عما وتیں ہیں یا سر افراز، سرنگوں انساں
یہ وہ زمیں ہے جہاں آسماں نہیں ملتا

سمجھ سکے گی نہ دنیا دلِ خراب کی بات
خموش ہوں کہ مرا ہمزباں نہیں ملتا

فریب و مکر کی دنیا میں حسن و عشق کہاں
کوئی خلوص کا بندہ یہاں نہیں ملتا

ترے جمال کا پر تو مرے خیال کا اوج
جگہ نہیں کوئی ایسی جہاں نہیں ملتا

ضیاؔ یہ خانہ بدوشوں سی زندگی کب تک
کہاں چھپاؤں سر اپنا مکاں نہیں ملتا

(بمبئی مئی ۱۹۶۶ء)



کیف کی شمعیں جلیں، بیدار میخانہ ہوا
شام آئی، رُوح جھومی مست پیمانہ ہوا

بات آئی تھی زباں پر، لے اُڑی بادِ صبا
مشتہر سارے چمن میں دل کا افسانہ ہوا

آج بھی ہوتی ہے شب بھر شمع و پروانہ میں بحث
کس نے دیوانہ بنایا، کون دیوانہ ہوا

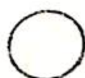
ان اندھیروں سے نپٹتا، کون ایسے وقت میں
برق اُدھر چمکی، اِدھر خاشاک کاشانہ ہوا

اک مقام ایسا بھی راہِ شوق میں آیا کہ دل
درد کا خوگر بنا، درماں سے بیگانہ ہوا

کام سے ہے کام، کچھ مطلب نہیں انجام سے
رازِ ہستی جس نے یہ جانا وہ فرزانہ ہوا

جب اُتر آئی ہماری دشمنی پر بوئے گل
اے صبا اس وقت اپنا دوست پیمانہ ہوا

(نئی دہلی مئی ۱۹۴۹ء)



گر نہ پڑتا ہی کسی دن تو سنبھل جاؤں گا
چاند تاروں سے بہت دور نکل جاؤں گا

مطمئن ہیں وہ مجھے دے کے اُمیدوں کے چراغ
طفلِ مکتب ہوں کھلونوں سے بہل جاؤں گا

میں اک انساں ہوں کوئی موم کی گڑیا تو نہیں
کہ مجھے ڈھالو گے جن سانچوں میں ڈھل جاؤں گا

اس بھری بزم میں ہے کون جسے اپنا کہوں
مشتعل آگ میں تنہائی کی جل جاؤں گا

عقل کے نقشِ قدم پر تو چلا جاتا ہوں
دل مرا چاہے گا جس وقت پھسل جاؤں گا

کوئی دیوانہ کرے گا نہ اُدھر کا پھر رُخ
جب ترے شہر کی گلیوں سے نکل جاؤں گا

محفلِ شوق میں آیا ہوں ضیاؔ مُہر بلب
گنگناتا ہوا پُرسوز غزل جاؤں گا



گُل بغیر رنگ و بُو یوں جس طرح کانٹا رہا
رُوح رُخصت ہو گئی تو جسم یہ پھر کیا رہا

منحصر تھا دل کی دھڑکن پر یہ ربطِ جسم و جاں
خون رگ رگ میں پیامِ زندگی دیتا رہا

اُس کے قدموں پر نہ کیوں منزل جبیں سائی کرے
رہنما جس قافلے کا تیرا نقشِ پا رہا

دوستوں کی بے وفائی کی شکایت کیا کروں
تھا مری قسمت میں رونا عمر بھر روتا رہا

آج تک مرہونِ منّت، اُن شہیدوں کا ہے خون
جن کو مقتل پر بھی دھوکا تیری محفل کا رہا

دیکھ کر بھی دیکھنے کی طرح کب دیکھا اُنہیں
سامنے آئے وہ لیکن درمیاں پردہ رہا

کس لئے مرگِ ضیا پر آہ و زاری شور و غل
کیا بُرا ہے مر گیا زندوں سے تو اچھا رہا



مجھے کوئی ہنر نہیں آتا
اور ہو تو نظر نہیں آتا
آمدِ صبح کا یقیں تو بجا
چین کیوں رات بھر نہیں آتا
یاد آتا ہے تو مجھے بھی کیوں
میں تجھے یاد اگر نہیں آتا
کیا بُرائی ہے اب زمانے میں
کوئی اچھا نظر نہیں آتا
چاند خود چاندنی کے زینے سے
کیوں زمیں پر اُتر نہیں آتا
رگِ احساس میں سمایا ہے
آنکھ سے جو نظر نہیں آتا
گمرہی میں ہے اک لطفِ ضیا
جادۂ بے راہ پر نہیں آتا

(امرتسر ۱۹۳۳ء)



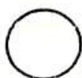
مقام اے غمِ زیست پہچان اپنا
نہیں اب تو مرنا بھی آسان اپنا
یہ ساحل پسندی کی محرومیاں ہیں
نہ اپنا سفینہ، نہ طوفان اپنا
ستاروں پہ ڈالی ہیں کیا کیا کمندیں
مُقدّر بدلتا ہے انسان اپنا
نہ ہو جائے دھڑکن کی رفتار مدھم
نکل جائے دل سے نہ ارمان اپنا
جنہیں بات رکھنی بھی ہے بارِ خاطر
وہ کب یاد رکھتے ہیں پیمان اپنا
گزرنا ہے کانٹوں کے رستے سے جن کو
بچائیں وہ کب تک گریبان اپنا
ضیا جو اُفق سے نمودار ہوگی
اُسی صبح پر لاؤ ایمان اپنا

(دہلی ستمبر ۱۹۴۸ء)



میرا دامن بھی بھگویا ہوتا
مجھ کو اشکوں میں ڈبویا ہوتا
کس طرح کوئی جگاتا اس کو
کھلی آنکھوں سے جو سویا ہوتا
ڈھونڈنے والے نے منزل کا نشاں
پا کے خود کو کبھی کھویا ہوتا
آبلہ پائی کی لذت توبہ
کوئی کانٹا ہی چبھویا ہوتا
بدگمانی کی بھی حد ہوتی ہے
کاش کہ آئینہ گویا ہوتا
فصل کیوں کاٹتے زخموں کی اگر
بیج نفرت کا نہ بویا ہوتا
اے ضیا مشقِ سخن میں تو نے
قیمتی وقت نہ کھویا ہوتا

(نئی دہلی فروری ۱۹۷۷ء)



میرا وجود ٹوٹ کے سانچے میں ڈھل گیا
گرمی سے حادثات کی شیشہ پگھل گیا

کانٹا کسی کے تلوے میں چبھنے کی دیر تھی
شہتیر آنکھ کا نظر آیا، نکل گیا

وہ دھوپ کیا، جو سایہ میں دبکی پڑی رہی
سورج وہ کیا، جو آگ میں اپنی ہی جل گیا

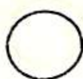
آئی نہ ہاتھ گردشِ ایام آج تک
انساں ہزار وقت کے سانچے میں ڈھل گیا

شامل تھا ترکِ مے میں بھی احساسِ تشنگی
بدلی کو دیکھتے ہی ارادہ بدل گیا

جنّت کا ہے خیال نہ دوزخ کی فکر ہے
جادو غمِ حیات کا کیا دل پہ چل گیا

منزل نے آپ بڑھ کے اُسی کے قدم لئے
جو راہِ پا شکستہ میں ضیاؔ سر کے بل گیا

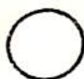
(نئی دہلی اپریل ۱۹۷۹ء)



نالہ و فریاد سے ہوتا ہے کیا
آبروِ اُمید کی کھوتا ہے کیا
سر پہ سورج آ گیا، آنکھیں تو کھول
اب بھی چادر تان کر سوتا ہے کیا
خون کا قطرہ بھی آنکھوں میں نہیں
دل میں تخمِ آرزو بوتا ہے کیا
کشمکش میں زندگی و موت کی
آدمی پاتا ہے کیا کھوتا ہے کیا
خونِ ناحق یوں کبھی دُھلتا نہیں
آنسوؤں سے آستیں دھوتا ہے کیا
بجلیاں جس پر بنالیں آشیاں
وہ شجر بھی باثمر ہوتا ہے کیا
اے ضیا مدّت ہوئی دل مر چکا
اب دوا کر یا دعا ہوتا ہے کیا



وہ وقت، جب یہ نظامِ کہن نہیں رہتا
قدم زمیں پہ، سروں پہ گگن نہیں رہتا
جہاں جہاں نہیں ہوتا ترا کرم مجھ پر
وہاں وہاں میرا دیوانہ پن نہیں رہتا
جو میرا ایں مجھے مل جائے تو کہوں اُس سے
بدن بھی دشمن ہے ہمیشہ یہ دشمن نہیں رہتا
نہ چھیڑ بادِ بہاری، نہ اور مجھ کو ستا
کہ وہ نہ ہوں تو چمن بھی چمن نہیں رہتا
خوشی نشاط کی کیا ہے، الم کا غم کیوں ہے
بدلتے وقت کا یکساں چلن نہیں رہتا
نظر سے دیر و حرم کے جب اُٹھتے ہیں پردے
تو کوئی شیخ، کوئی برہمن نہیں رہتا
غرض نہیں کہ وہ کھوٹا ہے یا کھرا ہے ضیا
کسی بھی سکّے کا پیہم چلن نہیں رہتا

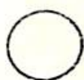


ہمیں غم بھی دنیا کا چھلتا رہے گا
نگاہوں کا جادو بھی چلتا رہے گا
اُسے وقت کیا کھوسے گا جو ہمیشہ
ملا کر قدم ساتھ چلتا رہے گا
زمانہ تو کروٹ بدلتا رہا ہے
زمانہ تو کروٹ بدلتا رہے گا
رہِ عشق میں ہر قدم پر ہے ٹھوکر
جو گرتا رہے گا سنبھلتا رہے گا
دیے جاؤ اُس کو اُمیدیں، دلاسے
کھلونوں سے ہی دل بہلتا رہے گا
اسی طرح چھپتے رہیں گے ستارے
اسی طرح سورج نکلتا رہے گا
ضیاؔ، دل مرا طُور ساماںیوں میں
مچلتا رہا ہے، مچلتا رہے گا

(نئی دہلی دسمبر ۱۹۷۷ء)



ہوئے وہ دشمنِ جور و جفا کیا
وفا سے لے دلِ ناداں، ملا کیا
تری وعدہ خلافی کا گلا کیا
کیا ہیں نے کوئی وعدہ وفا کیا؟
خُدا پر چھوڑ دوں کیا دل کی کشتی
اُٹھا دوں اعتبارِ ناخُدا کیا
ہتھیلی کی لکیریں کہہ رہی ہیں
مری تقدیر میں لکھا ہے کیا کیا
بہ عُنوانِ دِگر دُہرائے جاؤں
وہی قصّہ کلیم و طُور کا کیا
یہ بستی ہے زبوں حالوں کی بستی
تلاشِ سایۂ بالِ ہُما کیا
غزل کہنا اِسے آیا نہ، خُود کو
خُدا جانے سمجھتا ہے ضیا کیا



بول کڑوا ہی بولئے صاحب
لبِ گفتار کھولئے صاحب
ڈال دی ہے جو بدگمانی نے
وہ گرہ دل کی کھولئے صاحب
ہمہ تن گوش ہیں درو دیوار
ذرا آہستہ بولئے صاحب
یوں تو کوئی بڑا نہیں بنتا
کیوں بڑا بول بولئے صاحب
پلٹ آئے ہیں، اجنبی تو نہیں
گھر کا دروازہ کھولئے صاحب
ہم پہ دھرتے ہیں تہمتِ اُلفت
اپنا دل تو ٹٹولئے صاحب
آج ہر سمت ہے ضیا ہی ضیا
اپنی آنکھیں تو کھولئے صاحب

(نئی دہلی جنوری ۱۹۸۰ء)



ضربِ تیشہ لگا رہی ہے دُھوپ
بوڑھی دیوار ڈھا رہی ہے دُھوپ
آسماں سے اُتر کے دھرتی پر
سوئے فتنے جگا رہی ہے دُھوپ
گردشِ خوں کو تیز تر کر کے
تپشِ دل بڑھا رہی ہے دُھوپ
شب گزیدوں کو کیا خبر اس کی
آ رہی ہے کہ جا رہی ہے دُھوپ
کیوں نہیں پھونک دیتی پاس آ کر
دُور سے کیا جلا رہی ہے دُھوپ
سائے سے بے نیاز و بے پروا
دشت میں گھر بنا رہی ہے دُھوپ
سُنیئے، شاید ضیاؔ کی تازہ غزل
زیرِ لب گنگنا رہی ہے دُھوپ

(نئی دہلی مارچ ۱۹۷۳ء)



چار سُو دودِ عشق ہَوا پر اُڑتے میخانے بہت
لب سلامت، چوم لیں گے بڑھ کے پیمانے بہت

ہے یقیناً دل کی بربادی میں شامل غم کا ہاتھ
پھر بھی کیوں ہیں غم سے اُمیدیں، خدا جانے بہت

کوئی ایسا بھی تو ہو، اپنا جسے ہم کہہ سکیں
لوگ مل جاتے ہیں یوں تو جانے پہچانے بہت

نوحہ خواں مرگِ محبّت پر ہے کیا مرغِ اسیر
اشکِ خوں پلکوں پہ آئے دل کو سمجھانے بہت

ناقۂ لیلیٰ کا پایا قیس نے تنہا سُراغ
صحرا صحرا پھرتے تھے آوارہ دیوانے بہت

شور و شر کے دام میں آخر سمٹ کر رہ گئے
بستیوں سے بھاگتے تھے دُور ویرانے بہت

ایک پل سونے نہ پایا، اے ضیاؔ رونا رہا
دل کو رکھا مضطرب شب بھر تمنّا نے بہت

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۷ء)



ذکرِ سم و صلیب نہ دار و رسن کی بات
کرتے ہیں لوگ حرص و ہوس ، مکر و فن کی بات
اب اور کیا بہار گلستاں میں آئے گی
آئی زبانِ خار پہ گُل پیرہن کی بات
ہمدم نہیں ، رفیق نہیں ، آشنا نہیں
اب کیا کہوں کسی سے دلِ پُر محن کی بات
کچھ بات ہے کہ آئی ہوا ، کھل گئے کواڑ
اہلِ قفس بھی کرتے ہیں صحنِ چمن کی بات
لُٹتا ہے یا پہنچتا ہے منزل پہ کارواں
رہبر کی بات بنتی ہے یا راہ زن کی بات
اے شمع تو پگھلتی ہے آتش بجاں ہوں میں
جو بات میرے من کی ، وہی تیرے من کی بات
کانٹوں کو نسبتیں تھیں خزاں سے مگر ضیا
رکھ لی بہار نے گُل و سرو و سمن کی بات



ہے وہ اب شام کی صورت نہ سحر کی صورت
بدلی بدلی سی ہے خورشید و قمر کی صورت
پا شکن پیچ و خم، جادۂ ہستی ہیں تو کیا
نکل آتی ہے بہر گام سفر کی صورت
تو پریشان ہے کیوں، بہر سکونِ خاطر
میں نے پیدا کوئی پہلو میں اگر کی صورت
اجنبیت کا یہ احساس، یہ تنہائی کا غم
کل جو تھی دشت کی ہے آج وہ گھر کی صورت
ننگے سورج نے کیا دشت میں وہ رقصِ شرر
کھو گئی دھوپ کے سائے میں شجر کی صورت
اب کہاں ڈھونڈنے جاؤں کہ ترا جلوۂ نو
بس گیا ہے مری آنکھوں میں نظر کی صورت
عشق میں کون کرے فکرِ کم و بیشِ ضیا
سود کی شکل سے ملتی ہے ضرر کی صورت

(نئی دہلی جون ۱۹۶۸ء)



ہے آگ میں اپنی ہی تو جلتا سُورج
اک روز یہ ہو جائے گا ٹھنڈا سُورج

اُٹھا، تو مٹا سلسلۂ ظلمت و نُور
تھا روئے شب تار کا پردا سُورج

ذرّوں کی تب و تاب سے دھرتی چمکی
اندیشۂ انجام سے کانپا سُورج

کیوں حال نہ روشن ہو مری دُنیا کا
ماضی ہے اگر چاند تو فردا سُورج

دیکھا نہ اسیروں نے کبھی کھول کے آنکھ
دیوار سے زنداں کی اُترتا سُورج

کمرے میں ابھی تک وہ اندھیرا ہے جو تھا
کیا صحن میں کرتا ہے اُجالا سورج

پوجے گئے بڑھتے ہوئے انوارِ ضیا
سجدوں سے نوازا گیا چڑھتا سُورج

(بمبئی اپریل ۱۹۶۸ء)



کلیم کو نہ مِلا اذنِ دیدِ طُور کے بعد
وہ جلوہ ہوگیا غائب کہاں ظہور کے بعد

تجھے میں ساقیا قاتل کہوں تو کس مُنہ سے
دیا ہے زہر مگر بادۂ طہور کے بعد

میں نامہ بر سے نہ کرتا سوال پر یہ سوال
وہ اپنا نام بھی لکھ دیتے جو سطور کے بعد

یہی دو رنگیٔ دُنیا ہے مُوجبِ ہستی
کہ شامِ تیرگی آتی ہے صبحِ نُور کے بعد

ہر ایک ذرّۂ دشتِ جنوں تھا جام بدست
میں دل شناس ہوا عقل کے فتور کے بعد

دل و دماغ پہ طاری ہے طرفہ کیفیت
شعور اپنا گیا ہے ترے شعور کے بعد

چلے ہو مانگنے جنّت تو اے صفیا پہلے
یہ سوچ لو کہ وہاں کیا ملے گا حُور کے بعد

(نئی دہلی جون ۱۹۸۰ء)



اک ایسا بھی آتا ہے وقت آدمی پر
بگڑتا ہے اپنے ہی جذبِ دلی پر

فلک رو رہا ہے زمیں ہنس رہی ہے
تری دشمنی پر، مری دوستی پر

کبھی زندگی آدمی پہ تھی قرباں
نثار آج ہے آدمی زندگی پر

تعجب ہے بجلی گری تو چمن میں
مرے آشیاں کو بچا کر کلی پر

یقیں آئے کیا تجھ پہ بندوں کو اب تو
صحیفہ نہیں ہوتا نازل کسی پر

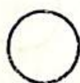
وہ پردہ الٹ کر شبستاں میں آتے
گماں روشنی کا ہوا تیرگی پر

ضیا کی غزل بھی وہ سن لیں، جنہیں ہے
بڑا ناز اپنی نئی شاعری پر



کیلئے گھر کو پھونک کر منتر
دُور کرتا ہے بد نظر منتر
تجربہ کر کے دیکھ لُوں میں بھی
رکھتا ہے کچھ نہ کچھ اثر منتر
آتے ہیں وہ نہ صبح ہوتی ہے
پڑھتا رہتا ہوں رات بھر منتر
پتھروں کے دلوں میں ہلچل ہے
آ گیا کیا زبان پر منتر
آسماں کا طلسم ٹوٹے گا
یونہی پڑھتے رہے اگر منتر
کر ہی دے کامیاب غزلِ شوق
ایک دن ہم کو، کیا خبر منتر
بال و پر جن کے کٹ چکے ہیں ضیاؔ
اُن کو دیتا ہے بال و پر منتر

(مدراس ۱۳ مارچ ۱۹۸۰ء)



لہر سی دل میں اُٹھی موجۂ طوفاں ہو کر
رگِ جاں ڈوب گئی سازِ غزلخواں ہو کر

روز و شب کچھ بھی دھڑکنے کے سوا کام نہیں
یہ صلا خوب ملا، دل کو نمایاں ہو کر

دل شکستہ ہوں، کہیں ٹوٹ نہ جائے ڈر ہے
یہ مرا عہدِ وفا بھی ترا پیماں ہو کر

کر چکا ترکِ تعلق مگر اب بھی اکثر
ذہن میں یاد اُبھرتی ہے غزلخواں ہو کر

اجنبی اپنے وطن میں کوئی دشمن بھی نہ ہو
آئینہ دیکھ رہا ہے مجھے حیراں ہو کر

جام ٹوٹے ہوئے اُترا ہوا چہرہ مے کا
شامِ غم آئی ہے کیا صبحِ درخشاں ہو کر

اے ضیا بحرِ محبت کا کنارا معلوم
دل میں آیا غمِ انساں غمِ جاناں ہو کر

(بمبئی جولائی ۱۹۶۶ء)



مستی شراب کی ہے شرابِ کہن سے دُور
میں اپنے ہی وطن میں ہُوں اپنے وطن سے دُور!

ویرانماں خراب ہُوں، جاتا ہُوں جب اُدھر
بھاگے ہے دشت بھی مرے دیوانہ پن سے دُور

کھا کر ترس سمیٹ لیا میں نے ہی اُسے
بکھری پڑی تھی رُوح حصارِ بدن سے دُور

آوارگی درست مگر واہ رے جنوں
پھینکا ہے لا کے مجھ کو کہاں انجمن سے دُور

یہ سوچ کے ہُوں گوشۂ زنداں میں مطمئن
کیا کام رنگ و نکہتِ گُل کا چمن سے دُور

دانشورانِ عصر نے جدّت کے نام پر
رکھی اساسِ قصرِ سخن، شہرِ فن سے دُور

منزل کا آج بھی ہے ضیا مطمحِ نظر
وہ جادہ آشنا جو نہیں راہزن سے دُور

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۳ء)



اک نظر دیکھ نہ لیتے وہ اگر دل کی طرف
ہاتھ کون اپنے بڑھاتا مہِ کامل کی طرف

محبسِ زیست میں روز افزوں ہے دل کی دھڑکن
کون دے کان یہاں شورِ سلاسل کی طرف

بھیک انصاف کی پاؤں کبھی تو کس کے در سے
ساری دنیا ہے صف آرا مرے قاتل کی طرف

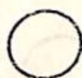
موجِ طوفاں کوئی ایسی بھی تو اٹھتی یارب!
موڑ دیتی رُخِ کشتی کو جو ساحل کی طرف

یہ وہ آئینہ ہے، ٹوٹا تو بکھر جائے گا
پھینکیے سنگِ ملامت نہ مرے دل کی طرف

اُف وہ پروانے جو شعلوں سے گلے مل نہ سکے
دیکھتے رہ گئے شمعِ سرِ محفل کی طرف

اے ضیا! قافلۂ اشکِ رواں تھا جب تک
انگلیاں لوگ اٹھاتے ہی رہے دل کی طرف

(نئی دہلی فروری ۱۹۸۰ء)



اوجِ پستی ہے محبت کا اثر ہونے تک
ہوش رہتا ہے کسے اپنی خبر ہونے تک

جانے پھر دل میں ہو کب جذبۂ وحشت بیدار
کیوں نہ سر پھوڑ لیں دیوار کے در ہونے تک

آنکھ کھلتے ہی کھلا رازِ وجودِ گل و آب
جلوے در پردہ تھے توفیقِ نظر ہونے تک

خاک اُڑتی ہے کہ دریائے وفا خشک ہوا
آنکھ روتی ہے لہو، دل کا ضرر ہونے تک

کوئی وحشی ترے کوچے میں در آیا ہے مگر
چاہیے وقت کسی سنگ کے سر ہونے تک

خاکِ پروانہ پہ تھی رات کی وزدانہ نظر
شمع جلتی رہی تخلیقِ سحر ہونے تک

کس قدر حشر بپا ہوں گے ضیاؔ دنیا میں
موم، فریاد سے پتھر کا جگر ہونے تک

(احمد آباد بمبئی ۱۹۶۷ء)



آس جینے کی زندگی کی اُمنگ
اب کرے کون فکرِ نام و ننگ

مرگِ بُلبُل کی دی خبر کس نے
اُڑ گیا ادھ کھلی کلی کا رنگ

پستیٔ فطرتِ بشر، توبہ
صُلح جوئی بھی بن بنائے جنگ

پھر درِ دل پہ سر بہ سجدہ ہوں
عقل کی اُلجھنوں سے آکر تنگ

ہائے کب باغ میں بہار آئی
سر میں سودا ہے اب نہ دل میں اُمنگ

عزمِ پرواز پر بُریدہ ہے
وسعتِ کائنات ہے دلتنگ

ہو گیا دل کے آر پار ضیاؔ
تھا کسی خود نگر نظر کا خدنگ

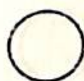


بادہ و ابرِ و بہار و نکہت و رنگ
کون کہتا ہے کائنات ہے تنگ
ڈھیل دیتا ہوں چھوڑتا ہوں ڈور
چونچ سُورج کی لے اُڑی ہے پتنگ
کائنات' اور اس قدر محدود
آدمی' اور اس قدر دل تنگ
باغ بھی ریگ زار ہے کوئی
عندلیبیں خموش گُل بے رنگ
کس دوراہے پہ یاس نے گھیرا
گھر سے نکلا تھا دل میں لے کے اُمنگ
دار پر امن کو چڑھاتے ہیں
کھیل بچوں کا ہے بڑوں کی جنگ
اے ضیا پارسائی کیا جانے
کس کو کہتے ہیں فکرِ نام و ننگ

(نئی دہلی نومبر ۱۹۷۰ء)



تن بدن میں لگی ہے آگ ہی آگ
ہیں نہ کہتا تھا روشنی سے بھاگ
شور شوں میں سکوں کے خواب دیکھ
آگیا سر پہ سورج اب تو جاگ
اب خیال اُن کا دل میں آتا ہے
جیسے پھنکارتا ہوا کوئی ناگ
الاماں ، سرد مہری دُنیا
مطرب چھیڑ کوئی دیپک راگ
رات کی گود ہو گئی سُونی
جنگلوں میں لگائی کس نے آگ
کارگاہِ حیات کے دو رُخ
عقل کا شعبہ اور دل کا وبھاگ
لی ضیا درد نے پھر انگڑائی
ہوئے بیدار دل کے سوئے بھاگ



آنکھیں آنکھیں چنچل چنچل
روشن روشن جھیلوں میں کنول
کیا رُوپ ہیں حُسن و جوانی کے
شوخی چنچلتا اور چھل بل
وہ رند نہیں وہ جام نہیں
دُنیا بدلی تُو بھی تو بدل
خوابوں میں کسی کی یادوں کے
میں نے بھی بنائے تاج محل
یہ انگ ہیں چڑھتی جوانی کے
ننھّے ننھّے ، کومل کومل
وہ حُسن کو کہتے ہیں اچھا
دیتا ہوں محبت پر میں بل
کرتی ہے اشاروں میں باتیں
کہتے ہیں ضیا ہم جس کو غزل



دُنیا ہے اِک جنگل
جنگل میں ہے منگل
دل کی سجدہ گاہیں
صحرا، وادی، جنگل
ڈوبے چین دلوں کا
پیار، انوکھا دنگل
جس کے سر میں سودا
اس کے پانوں میں سنگل
انسانوں کی قسمت
سورج، چاند اور منگل
اچھے فلم کی پہچان
گانا ناچ اور دنگل
دل میں صبا اُگ آئے
پھر یادوں کے جنگل

(بمبئی ۱۹۶۸ء)



جلووں سے معمُور ہیں ہم
پردوں میں مستُور ہیں ہم
ذوقِ عمل پر شرمندہ
سعیِ نا مشکُور ہیں ہم
کا ئے سُورج سے کہہ دو
شمعِ شبِ دیجور ہیں ہم
کچھ مرنے کا خوف اور کچھ
جینے پر مجبُور ہیں ہم
اُٹھ کر، رشکِ قوسِ قزح
گر کر چکنا چُور ہیں ہم
ہم سے اُتنے پاس ہو تم
تم سے جتنے دُور ہیں ہم
بزم میں نظاروں کی ضیا
ناظر اور منظور ہیں ہم

(نئی دہلی جنوری ۱۹۷۹ء)



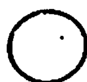
شغلِ سبو و جام کئے جا رہے ہیں ہم
کیا کیا نہ اپنے دل پہ ستم ڈھا رہے ہیں ہم
خود کو کریں تلاش کہاں بزمِ شوق میں
کھوئے ہوئے ہیں یوں کہ انہیں پا رہے ہیں ہم
رہبر کی کچھ خبر ہے نہ منزل کا کچھ پتہ
تو بھی رہِ وفا میں بڑھے جا رہے ہیں ہم
کب تک یہ بے حسی کا بھرم مسکرا بھی دے
اے زندگی فریب ترے کھا رہے ہیں ہم
اپنا وجود اس کے سوا اور کچھ نہیں
تم دیکھ لو اگر تو نظر آ رہے ہیں ہم
انکار جس کی تھا را شگافی سے کفرِ غم
اشکوں میں ڈوب کر وہ غزل گا رہے ہیں ہم
زخموں کی شکل میں ہی سہی کچھ تو اے ضیا
اُس بے وفا سے دادِ وفا پا رہے ہیں ہم

(نئی دہلی اگست ۱۹۷۳ء)



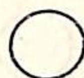
آریوں، کولوں اور بھیلوں میں
آدمی بٹ گیا قبیلوں میں
چھوڑتا جا رہا ہے وقت کھنڈر
کوئی بستی نہیں ہے میلوں میں
شورشِ کائنات روز افزوں
زندگی زندگی کے حیلوں میں
یوں خیالوں میں جلوہ گر ہے کوئی
عکسِ مہتاب جیسے جھیلوں میں
ریگ زاروں میں عشق آوارہ
حُسن پابند ہے فصیلوں میں
گھر میں ہے جھگڑا بلاؤں کا
کچھ اثر ہی نہیں ہے کیلوں میں
ظُلم سہتا ہوں کچھ نہیں کہتا
میں کبھی تھوں اے ضیا ہٹیلوں میں

(نئی دہلی نومبر ۱۹۶۵ء)



بے نیاز ہوش دُنیا سے ہوں بیگانہ کہاں
مجھ کو ساقی نے دیا ہے بھر کے پیمانہ کہاں
بند باب میکدہ ہے، وا درِ کعبہ نہیں
چھوڑ کر کوچہ ترا پھر جائے دیوانہ کہاں
دل لگی کی بات ہے کچھ اور، ورنہ شامِ غم
شمع کے جلنے سے جل جاتا ہے پروانہ کہاں
پائے ایماں لڑکھڑ لئے، دولتِ دیں لٹ گئی
آ گیا یہ جادۂ کعبہ میں خمخانہ کہاں
چاکِ دامن میں مرے جھانکو، نہ پوچھو مجھ سے تُم
قیس ایسا ہے کوئی دُنیا میں دیوانہ کہاں
جن پہ بنیادِ غزل رکھی تھی اہلِ ذوق نے
اب وہ آئینہ کہاں، وہ گیسو و شانہ کہاں
اے ضیا مطلع پہ آ پہنچی غزل لیکن ہنوز
اُن سے کہہ پایا ہوں اپنے دل کا افسانہ کہاں

(نئی دہلی جولائی ۱۹۷۳ء)



جاتی ہے آسماں سے بھی آگے نظر کہاں
اُن کی خبر ملی تو پھر اپنی خبر کہاں

سیلابِ گریہ، رقصِ شرر، نالۂ سکوت
ہوتی ہے اس طرح شبِ غم مختصر کہاں

یہ پردہ دارِ حُسن، وہ غمّازِ رازِ عشق
آنچل ترا کہاں، مرا دامانِ تر کہاں

طاری دل و دماغ پہ ہے بے خودیِ شوق
رندوں کو فکرِ گردشِ شمس و قمر کہاں

سجدہ طلب ہے اب بھی ترا سنگِ در، مگر
تھا جس کو شوقِ سجدہ وہ شوریدہ سر کہاں

گلہائے نوشگفتہ کی نکہت لئے ہوئے
زنداں میں آگئی ہے نسیمِ سحر کہاں

اب یہ نہ پوچھ میرا دلِ ناتواں صفیؔ
زخموں میں ڈھونڈتا ہے دوا کا اثر کہاں

(بمبئی ستمبر ۱۹۶۶ء)



جسمِ کون و مکاں ہے تیرا بدن
پیکرِ دو جہاں ہے تیرا بدن
مڑتی، لہراتی، لگاتی، بل کھاتی
موجِ آبِ رواں ہے تیرا بدن
لوچ، نرمی، سرورِ جاں بخشی
نغمگی کا سماں ہے تیرا بدن
دل میں خوشبو کہاں سے آتی ہے
آنکھ سے جب نہاں ہے تیرا بدن
اک مجسّم غزل کہوں تجھ کو
شاعری کی زباں ہے تیرا بدن
چھوتے ہی انگلیاں جھلس جائیں
کوئی برقِ تپاں ہے تیرا بدن
اس غزل پر ضیا کا یہ دعویٰ
میرا حسنِ بیاں ہے تیرا بدن

(احمد آباد دسمبر ۱۹۶۶ء)



حال دل کہنے میں تو عار نہیں
جانتا ہوں کہ تجھ کو پیار نہیں

دے کے دل ہوں اُمیدوارِ نظر
نقد سودا ہے یہ اُدھار نہیں

رُوٹھی بیٹھی ہے موت بھی مجھ سے
زندگی بھی تو سازگار نہیں

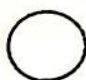
یہ پلٹ کر کبھی نہیں آتا
وقت کا کوئی اعتبار نہیں

تو زمیں پر مری اُتر بھی آ
آسماں سے مجھے پُکار نہیں

زندگی سے نہیں ہے پیار جسے
زندگی کو بھی اُس سے پیار نہیں

کوئی اس دورِ کج کلاہی میں
اے ضیا تجھ سا وضعدار نہیں

(نئی دہلی جولائی ۱۹۷۵ء)



حسن کی فتنہ سازیاں نہ گئیں
عشق کی غم نوازیاں نہ گئیں

لاکھ روکا جتن کئے لیکن
درد کی سرفرازیاں نہ گئیں

آدمی مطمئن ہوا نہ کبھی
دل کی شکوہ طرازیاں نہ گئیں

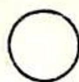
نہ ہوئی درد میں کمی نہ ہوئی
نہ گئیں چارہ سازیاں نہ گئیں

ہم ہوئے منحرف مگر آقا
تیری بندہ نوازیاں نہ گئیں

نہ ہوئی ختم زندگی جب تک
موت کی حیلہ سازیاں نہ گئیں

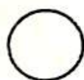
آشیاں اجڑا، مرغ بسمل کی
اے ضیا نغمہ سازیاں نہ گئیں

(لاہور اکتوبر ۱۹۳۳ء)



خرد کا مداوا کیا چاہتا ہُوں
درِ دل پہ سجدہ کیا چاہتا ہُوں
بصد نامرادی، بصد تشنہ کامی
ہیں ترکِ تمنّا کیا چاہتا ہُوں
گھر اپنا جلا کر، جہاں تک ہے ظلمت
وہاں تک اُجالا کیا چاہتا ہُوں
خجل ہے وفا، گریہ سامانیوں سے
محبّت کو رُسوا کیا چاہتا ہُوں
جسے ظلمتِ دوش کہتی ہے دُنیا
اُسے صبحِ فردا کیا چاہتا ہُوں
اندھیرے سے ہوتا ہے جو نور پیدا
اُسی کا تماشا کیا چاہتا ہُوں
ضیا اپنے اشعار سے زندگی میں
نیا حُسن پیدا کیا چاہتا ہُوں

(بمبئی دسمبر ۱۹۶۶ء)



دیتا ہے جلوہ آنکھ کو دعوت ہی اب کہاں
آتی ہے لب پہ دل کی حکایت ہی اب کہاں

یہ غلغلہ، یہ شور، یہ ہنگامہ، شامِ غم
ہے انتظارِ صبحِ قیامت ہی اب کہاں

کانٹے وہی ہیں، پھول وہی، بلبلیں وہی
لیکن عجوبہ کاریِ وحشت ہی اب کہاں

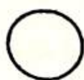
کیا آنکھ کھولیے یہاں، پہچانیے کسے
آئینہ خانہ میں کوئی صورت ہی اب کہاں

اس کاروبارِ زیست کی مصروفیت نہ پوچھ
انسان کو ہے مرنے کی فرصت ہی اب کہاں

دل کے نہاں کدے میں کوئی جلوہ یار ہے
پردے کی رہ گئی ہے ضرورت ہی اب کہاں

کہنے کو تو غزل ہے مگر اس میں اے ضیا
شوخی ہی اب کہاں ہے شرارت ہی اب کہاں

(نئی دہلی اکتوبر ۱۹۸۰ء)



دیا ہو تو نے سہارا کبھی، ہوا ابھی نہیں
تو اپنی آنکھ سے لیکن مجھے گرا ابھی نہیں

یہ دو دھڑکتے ہوئے دل ملیں تو کیسے ملیں
جو فیصلہ ہے مرا، تیرا فیصلہ بھی نہیں

عجیب بات ہے جن سے ملا ہے درد مجھے
انہیں کے پاس مرے درد کی دوا بھی نہیں

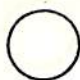
بیانِ حسن میں کھلتی نہیں زبانِ غزل
مقابل آج ترے رخ کے آئینہ بھی نہیں

مرے سفینہ کو آتا ہے ڈوب جانا بھی
امیدِ ساحلِ مقصود اگر ذرا بھی نہیں

تمہارے شہر میں آکر ہوا مجھے معلوم
میں اجنبی ہوں کوئی میرا آشنا بھی نہیں

میں سانس لوں تو ضیا کیا دیارِ الفت میں
گھٹی گھٹی سی فضا ہے کھلی ہوا بھی نہیں

(نئی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء)



رسمِ اُلفت نبھائے جاتے ہیں
بھُول کر یاد آئے جاتے ہیں
شاخِ گُل ہے نہ آشیاں کا پتہ
بجلیاں کیا گرائے جاتے ہیں
اے خوشا آمدِ نویدِ سحر
شب کے پہر ہوں سائے جاتے ہیں
وہ تری بزمِ ناز تھی ورنہ
ہم کہیں بن بُلائے جاتے ہیں
خواب کیا دیکھ آئے دیوانے
تاج محلوں کو ڈھائے جاتے ہیں
دل جلوں سے کوئی تو یہ پُوچھے
کس لئے دِل جلائے جاتے ہیں
ہم ضیا اس زمینِ سادہ میں
شعرِ رنگیں اُگائے جاتے ہیں

(نئی دہلی جون ۱۹۸۰ء)



روشن اشکوں سے چراغِ شبِ غم کرتے ہیں
غمِ ہستی میں کہاں فکرِ عدم کرتے ہیں

بھاگ کر دُور کہاں جائیگی اب منزلِ شوق
کام رہبر کا مرے نقشِ قدم کرتے ہیں

سرخرو ہوتے ہیں عشق چمنستاں میں وہی
خونِ دل سے جو رقم قصۂ غم کرتے ہیں

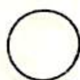
بارور ہونے سے پہلے یہ ہوا کے جھونکے
ٹوٹ جاتی ہے جو ٹہنی اُسے خم کرتے ہیں

حق تو یہ ہے کہ ہمیں بندگیٔ حق ہے عزیز
شوق سے اپنا سرِ شوق قلم کرتے ہیں

یہ سمجھ کر ہی تو لب بستہ ہیں شہرِ دل میں
بیش کرتے ہیں ستم، لطف تو کم کرتے ہیں

ایسے فرزانوں کو کہتے ہیں ضیا دیوانے
آگ پانی کو جو خوابوں میں بہم کرتے ہیں

(نئی دہلی اپریل ۱۹۸۰ء)



سُنا بھی تُو نے نہیں، میں نے کچھ کہا بھی نہیں
خموش ہوں کہ شکایت کا حوصلا بھی نہیں

یہ انتہائے جنوں، یہ کمالِ حُسن و جمال
ابھی تو عہدِ محبّت کی ابتدا بھی نہیں

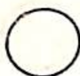
بڑے مزے میں ہیں کُنجِ قفس میں اہلِ چمن
کہ آشیاں بھی نہیں، خوف برق کا بھی نہیں

کلی کا اُترا ہوا چہرہ کس نے دیکھا ہے
صبا کے ہاتھ میں سورج کا آئینہ بھی نہیں

جُھلستی دُھوپ میں جلتے ہیں کس طرح پیاسے
کنویں میں رہتا ہے جو اُس کو یہ پتا بھی نہیں

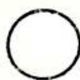
نہ جانے کس لئے پھر جاگنے سے ڈرتا ہُوں
مجھے خبر ہے کہ عالم یہ خواب کا بھی نہیں

نہ جلوۂ گُل و لالہ، نہ رقصِ نکہت و رنگ
غزل سرا چمنِ شعر میں ضیا بھی نہیں



صحرا کی تپتی دھوپ سے امید کیا کریں
سایہ ملے شجر کا تو پتّے ہوا کریں
سولی پہ چڑھ کے جن کو ملیں سرفرازیاں
وہ بے گماں نیازِ محبّت ادا کریں
مایوس کیوں ہیں چارہ گرانِ غمِ حیات
حاصل ہوا دوا سے نہ کچھ تو دعا کریں
یہ وقت ہے کہ کنجِ قفس کے سکوت کو
شورِ آشنائے حلقۂ زنجیرِ پا کریں
بھووں کی بھیک مانگ کے اوسان کھو چکا
اب دعوتِ نگاہ بغیر التجا کریں
جنّت سے تو نکالے گئے ہیں بفیضِ دل
تم بھی ہمیں نظر سے گرا دو تو کیا کریں
خوئے نیاز اپنی نہ چھوڑیں گے اے ضیا
ہم سے وہ بے نیاز اگر ہیں، ہوا کریں!

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۷ء)



گراں سے بیکراں تک آ گئے ہیں
مکاں سے لامکاں تک آ گئے ہیں
نگاہِ حُسن بیں سے جو چلے تھے
نگاہِ نکتہ داں تک آ گئے ہیں
چلے تھے ہم کہاں سے کون جانے
خبر کس کو کہاں تک آ گئے ہیں
تری مست انکھڑیوں کی آرزو میں
شرابِ ارغواں تک آ گئے ہیں
نجوم و ماہ بن کر کیوں نہ چمکیں
جو ذرّے آسماں تک آ گئے ہیں
وہی طوفاں جو تھے منجدھار کا حق
لبِ جُوئے رواں تک آ گئے ہیں
درِ زنداں، ضیا، اب کھول بھی دو
گُل اُڑ کے آشیاں تک آ گئے ہیں۔

(نئی دہلی دسمبر ۱۹۷۹ء)



کشمکش میں ہستی کی کب سے مبتلا ہوں میں
دل کی آرزوؤں کا خون کر رہا ہوں میں

غم نے اس قدر میرے دل پہ پا لیا قابو
اپنی ہر تمنا کو ترک کر چکا ہوں میں

ڈوبنا ہی جب ٹھہرا کیا خدا کو دوں تکلیف
اپنے دل کی کشتی کا خود ہی ناخدا ہوں میں

حسن میری نظروں میں اک فریب رنگیں ہے
فطرتِ محبت سے خوب آشنا ہوں میں

دیکھنا ہے تو مجھ کو تا بہ کے نہیں ملتا
اپنے آپ کو کھو کر تجھ کو ڈھونڈتا ہوں میں

میرے چارہ سازوں سے کاش کوئی یہ کہہ دے
آپ زخم ہوں اپنا، آپ ہی دوا ہوں میں

کام کیا ضیا مجھ کو فکرِ بزمِ امکاں سے
سرحدِ تمنا سے آگے بڑھ گیا ہوں میں



کہیں یہ درد ہی اے دل تری دوا تو نہیں
مری وفا کا تقاضا کوئی جفا تو نہیں

پیوں گا اور پیوں گا، ڈروں گا کس سے ڈروں
یہ میکدہ ہے کوئی خانۂ خدا تو نہیں

نمک چھڑکتے ہیں کیوں لوگ میرے زخموں پر
یہی علاج مرے دل کا درد کا تو نہیں

جفا سے تجھ کو لگاؤ، وفا کا پاس مجھے
جو مدّعا ہے ترا، میرا مدّعا تو نہیں

کسی پہ چشمِ عنایت، کسی پہ مشقِ ستم
بجا ہے تم جو کہو، ورنہ یہ بجا تو نہیں

کشمکش یہ تلاطم، یہ دشمنی یہ فساد
حیات کہتا ہوں جس کو وہی قضا تو نہیں

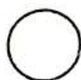
ضیا اک آگ سی دل میں سلگتی رہتی ہے
یہ ابتدا ہے محبّت کی انتہا تو نہیں

(دلّی اپریل ۱۹۶۶ء)



گو دُور سہی ، اُن سے منسوب کنارے ہیں
ملاحوں نے جو بپھرے طوفاں ہیں اُتارے ہیں
ناصح تری باتوں پر کر لیں تو یقیں لیکن
ہمدرد بھی ہے کوئی ؟ ہم درد کے مارے ہیں
اے مطربِ ہستی ، اس بربطِ شادی میں
کچھ گیت ہیں ایسے بھی اب تک جو کنوارے ہیں
کچھ بھی تو نہیں میرا ، دل بھی تو اُسے کیا دوں
دُنیا نے مرے آگے کیوں ہاتھ پسارے ہیں
زخموں پہ چھڑکتے ہی ہنستے ہیں نمک پیہم
اے دوست کچھ ایسے بھی غمخوار ہمارے ہیں
کیا نام ہمیں دے کر اب یاد کرے دُنیا
بازی میں محبت کی جیتے ہیں نہ ہارے ہیں
کہتے ہیں ضیا دل کو جو مائلِ مے نوشی
وہ کالی گھٹاؤں کے پُر نور اشارے ہیں

(نئی دہلی اگست ۱۹۷۹ء)



لالہ و گُل پہ اب نکھار کہاں؟
شوخیِ ابرِ نو بہار کہاں؟
زندگی ہے یہی تو جیتے جی
کشمکش سے رہِ فرار کہاں؟
ہیں دلوں میں کدورتیں، ورنہ
آئینہ خانوں میں غبار کہاں؟
شعلۂ طور، جلوہ فرما ہو
فرصتِ دید بار بار کہاں؟
بند ہونٹوں سے خشک آنکھوں سے
دل کا غم ہوگا آشکار کہاں؟
شک نہ ہونے کا ہے ابھی مجھ کو
میرے ہونے کا اعتبار کہاں؟
دامنِ ضبط چھوڑ کر جائیں
اے ضیاؔ ہم وفا شعار کہاں

(نئی دہلی اکتوبر ۱۹۷۹ء)



مجھے وہ سمجھتے ہیں جو ہیں ہا نہیں
نہ سمجھیں اگر کچھ بھی تو ہیں نا نہیں
قفس میں نہیں ، گو قفس ہی میں ہوں
ہوں صحنِ گلستاں میں گو میں نہیں
نشاں میرا پاؤ گے کیا راہ میں
سنبھل کر نہ تم جو چاہو ، ہیں نہیں
تعاقب مرا یوں کا کرتا رہا
مجھے غور سے دیکھ لو ، ہیں نہیں
وہ جو جھک گیا وقت کے سامنے
خدا را مجھے بخش دو ، ہیں نہیں
دوگانے کا یہ آخری سین ہے
مرے ساتھ مل کر کہو ، ہیں نہیں
بتا کیا مرا چاند دے گا تمہیں
ضیا تو ہوں ، مانگے کی ضو ہیں نہیں

(نئی دہلی نومبر ۱۹۸۰ء)



میری نگاہ بھی مجھے پہچانتی نہیں
حالانکہ تیرے شہر میں ہیں اجنبی نہیں

رنجور دھوپ سے ہوں نہ ہیں چاندنی سے خوش
دائم جہاں ہیں دھوپ نہیں چاندنی نہیں

شادابیِ چمن کی نشانی یہی تو ہے
وہ شاخِ خشک جو کبھی ہوتی ہری نہیں

دھرتی ہلے، ہوائیں چلیں، بجلیاں گریں
اک شاخ ہے درخت کو جو چھوڑتی نہیں

کھڑکی سے جھانک کر ذرا باہر تو دیکھ لوں
کیا وقت کا بھروسہ ابھی ہے ابھی نہیں

دنیا سے اب نبھے گی کہاں تک نہ پوچھئے
میں ڈھونڈتا ہوں، وہ تو مجھے ڈھونڈتی نہیں

اُن سے اُمیدِ دادِ غزل کس لئے ضیا
یہ شاعری ہے آج کی ناشاعری نہیں

(نئی دہلی اپریل ۱۹۷۸ء)



نشانِ منزلِ مقصود اور کیا دیکھیں
جبیں جھکائیں جہاں انکا نقشِ پا دیکھیں

نہ ذوق و شوقِ سکندر، نہ موجِ آبِ حیات
جنابِ خضر بھی اب اپنا راستا دیکھیں

حرم سے، دیر سے مایوس ہونے والوں کو
ہے اذنِ عام، اِدھر آئیں میکدا دیکھیں

نہ پوچھیں، یاد میں کاٹی ہے کس طرح شبِ غم
کتاب کھول کے اشکوں کا ماجرا دیکھیں

ہوا نہ جانے اسے کب کہاں اُڑا لے جائے
کدھر سے آئی ہے گاتی ہوئی گھٹا دیکھیں

گلوں کی پتّیاں جھڑ کر بنی ہیں فرشِ نظر
کہاں تک اب تجھے اے موجۂ صبا دیکھیں

نظر بھی ان کی ہے، بینائی بھی انہیں کی ضیا
بتوں کی شکل میں جو صورتِ خدا دیکھیں

(نئی دہلی جون ۱۹۸۰ء)



نہ ساقی ہے، نہ مینا ہے، نہ بادہ ہے، نہ پیالے ہیں
تو پھر اے زندگی! ہم اہلِ غم کس کے حوالے ہیں
اُٹھا تا ہے، اُٹھا دے شوق سے، یہ سوچ لے لیکن
ہم ایسے اور کتنے تیری محفل میں جیالے ہیں
تری دُنیا، مری دُنیا ہے لیکن واہ ری قسمت
تری دُنیا میں نغمے ہیں، مری دُنیا میں نالے ہیں
اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، مری خلوت کے گوشے میں
ترے جلووں کی محفل میں اُجالے ہی اُجالے ہیں
ٹھٹک جاتے ہیں چلتے چلتے ہم ہر موڑ پر، ورنہ
یہ رستے تو وہی ہیں جو ہمارے دیکھے بھالے ہیں
شکایت کیا، گلہ کیا، شکوہ کیا، اہلِ محبت نے
یہ نخلِ آرزو تو خونِ دل دے کر ہی پالے ہیں
نہیں معلوم شوکت کب آکے اُن کا زہر پی جائے
صنم! ہم نے جو اپنی آستیں میں سانپ پالے ہیں

(نئی دہلی اپریل ۱۹۷۷ء)



ہاتھ آئے تو ہواؤں میں اُڑائیں دامن
تار تار ایسا کہ کیا اُن کو دکھائیں دامن

ہم نے چاہا تھا کہ لب رکھ کے لبِ ساغر پر
غم و اندوہِ زمانہ سے چھڑائیں دامن

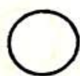
ہوشمندانہ کریں رقصِ بہار اہلِ چمن
چھیڑیں پھولوں کو تو کانٹوں سے بچائیں دامن

توڑ سکتے نہیں زنجیر تو اہلِ زنداں
سُرخ اشکوں ہی سے گلرنگ بنائیں دامن

ہوس و حرص کے جنگل میں یہ کیسی ہے کشش
کھینچتی رہتی ہیں ہر وقت ہوائیں دامن

برقِ سوزاں کو انہیں شاخوں سے نسبت کیوں ہو
اپنی ہی آگ میں جو اپنا جلائیں دامن

اے ضیا چھٹ نہ سکے گی کبھی بیرنگیِ دل
کہکشاں سے بھی اگر چھین کے لائیں دامن



ہے کوئی آزاد، کاٹے پانوں کی زنجیر کون
ہیں سبھی گھائل نکالے دل سے نوکِ تیر کون
اک نہ اک دن تجھ سے کہنا ہی پڑے گا حالِ دل
چارہ گر تیرے سوا ہے، اے محبت پیر کون
آبلہ پائی کو روتا ہے مگر اے دل بتا
گر نہ ہوتا خار، ہوتا اُس کا دامن گیر کون
دھوپ جس کو چاندنی ہو، زہر ہو آبِ حیات
تیرے دیوانوں میں ہے وہ صاحبِ تقدیر کون
کارواں بھی ہیں ہی، رہبر کارواں بھی ہیں ہی تنہا
فائزِ منزل ہوا میرے سوا رہگیر کون
یہ زمانہ امن کا ہے، جنگجوئی کو سلام
ہو مقابل شاخِ گل کے، ہوتی ہے شمشیر کون
بے نیازِ انجام سے ہو کر کرے کب تک عنیا
کارزارِ زندگی میں سعیِ بے تدبیر کون

(نئی دہلی جون ۱۹۷۸ء)



یاد آئے نہ کہیں آج کا دِن
خوں رُلائے نہ کہیں آج کا دِن
ہنسنا آیا ہے، خدا خیر کرے
رونا جائے نہ کہیں آج کا دِن
کل کے خوابوں کی حسیں جھیلوں میں
ڈوب جائے نہ کہیں آج کا دِن
کل پہ زندہ ہوں، مگر ڈرتا ہوں
ظُلم ڈھائے نہ کہیں آج کا دِن
دل کے ویرانے میں کھوئی ہوئی یاد
ڈھونڈ لائے نہ کہیں آج کا دِن
بزمِ ماضی میں یہ اِک حُسن و جمال
بار پائے نہ کہیں آج کا دن
رات سہمی ہوئی بیٹھی ہے ضیا
گنگنائے نہ کہیں آج کا دن

(بمبئی جنوری ۱۹۷۷ء)



یُوں تو بہت ہیں مُجھ میں ہُنر عیب کم نہیں
وہ وقت کیا، کہ شام و سحر جب بہم نہیں

دستک یہ کون دیتا ہے، دیکھوں کس طرح
عالم یہ نزع کا ہے مرے دم میں دم نہیں

جس دل میں تیری یاد ہے تیر اخیال ہے
اُس کو خوشی خوشی کی نہیں غم کا غم نہیں

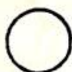
کر دیں جلا کے راکھ اُسے اب تو بجلیاں
کیا کام آشیاں کا جو گلشن میں ہم نہیں

لکھ لکھ کے کاٹ دیتا ہُوں ہر لفظ کا
شمشیر میرے ہاتھ میں ہے یہ قلم نہیں

تیر الیقیں تو وہم سے آگے نہ بڑھ سکا
میرا گمان عینِ یقیں ہے بھرم نہیں

کیا سوچتا ہے، اُٹھ کے اُٹھا، پی بھی جا ضیا
امرت بھرا ہے تیرے پیالے میں سم نہیں

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۹ء)



ابرِ پارہ ہوں، سرِ عرش اُچھالو مجھ کو
میں سمندر تو نہیں ہوں کہ کھنگالو مجھ کو

شمعیں داغوں کی جلا رکھی ہیں میں نے دل میں
شام کا وقت ہے، کیوں صبح پہ ٹالو مجھ کو

جاگتے رہتے ہیں جو سوئی ہوئی آنکھوں میں
گم انہیں خوابوں میں پاؤ گے خیالو مجھ کو

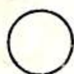
کونپلیں پھوٹیں، ہنسے پھول، مہک پھیل گئی
سالِ نو آیا، نئے سانچوں میں ڈھالو مجھ کو

انتظار آج بھی ہے چشمِ ثریا کو مرا
میں ہوں اک گیند، خلاؤں میں اُچھالو مجھ کو

عالمِ ہوش میں ہر گام پہ ہے لغزشِ نو
اب کوئی جام پلا کر ہی سنبھالو مجھ کو

ہوں ضیا، بزمِ سخن میں، نہ پھر آؤں گا نظر
دیکھ لو غور سے اب دیکھنے والو مجھ کو

(نئی دلی فروری ۱۹۸۰ء)



بہار آئی چمن میں، تم بھی مثلِ گُل ہنسو یارو
سُنو کچھ بلبلوں کی، اور کچھ اپنی کہو یارو

کہیں یوں بھی کٹی ہیں ہجر کی گھڑیاں زمانے میں
کہا تھا تم سے کس نے، رات بھر تارے گنو یارو

سمٹ آئیں گے اک مرکز پہ خورشید و مہ و انجم
محبّت کا وہ جذبہ، دل میں پیدا تو کرو یارو

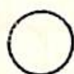
خطا میرے سوا اس میں کسی کی ہو نہیں سکتی
سمجھ کر بھی نہ سمجھو تم جو میری بات کو یارو

سفر میں بیٹھ جانا تھک کے توہینِ مسافت ہے
نہ آئے پاؤں میں لغزش، چلو تو یوں چلو یارو

زمانے کی ہوائیں، پھر زمانے کی ہوائیں ہیں
زمانے کی ہواؤں میں نہ تم اتنا اُڑو یارو

ضیاؔ کا قول رکھنا یاد رہ کر سربلندوں میں
جنہیں آتا ہے جھکنا، اُن کے آگے ہی جھکو یارو

(نئی دہلی اگست ۱۹۸۰ء)



دل کے ہر گوشے میں ہر سُو
پھیلی ہے یادوں کی خوشبُو
عشق کی رُسوائی کا باعث
ٹھنڈی آہیں جلتے آنسو
آموں کے اک پیڑ پہ بیٹھی
کوئل کرتی کُوکُو - کُوکُو
گردشِ مہر و ماہ نہ بدلی
کیا بدلے گی میری بھی خُو
آؤ مل کر ختم ہی کر دیں
روز کی یہ سب "مَیں مَیں، تُوتُو"
گردشِ روز و شب کا حاصل
صبحِ جبیں اور شامِ گیسو
کون ضیاؔ سے ملنے جائے
کم آمیزی ہے اُس کی خُو

(بمبئی مارچ ۱۹۶۸ء)



دوزخ میں ڈال دوں، نہیں ممکن بہشت کو
دیتا ہے کون خوب پہ ترجیح زشت کو
دوزخ کی آگ بڑھتی ہی آتی ہے دمبدم
رکھ دو اٹھا کے طاق میں کوئی بہشت کو
سر پیچ گیا ہے سایۂ دیوارِ دوست میں
الزام دے رہا ہوں میں کیا سنگ و خشت کو
طوفانِ برق و باد اٹھے، آئے زلزلے
بدلا نہ پھر بھی وقت نے اپنی سرشت کو
مستی میں عشق و حسن کی ڈوبا ہوا ہے دل
میزانِ عقل تولا کرے خوب و زشت کو
جب تک بھرا اٹھیں نہ برستی گھٹاؤں سے
دیتا رہوں گا خونِ جگر غم کی کشت کو
ہے اپنے دست و پا پہ بھروسہ ہمیں ضیا
پیشِ نگاہ کون رکھے سرنوشت کو

(نئی دہلی فروری ۱۹۷۸ء)



وا مرا دیدۂ بینا ہے تو
میں نے دنیا تجھے دیکھا ہے تو
اک نئی کاہکشاں کا منظر
میں نے پلکوں پہ سجایا ہے تو
آئینہ دیکھ کے معلوم ہوا
کوئی دیوانہ بھی مجھ سا ہے تو
پا بجولاں رہے قطرہ قطرہ
لمحے لمحے کا تقاضا ہے تو
کئی صدیوں سے جڑا ہوں اب تک
میرا میں ٹوٹ کے بکھرا ہے تو
عکس ہی عکس ہے لیکن ہر عکس
آئینہ خانے میں تنہا ہے تو
اے حنیف تو بھی کسی کا ہو جا
کوئی دنیا میں کسی کا ہے تو

(نئی دہلی فروری ۱۹۷۹ء)



یہ بزمِ مے ہے یہاں بےخودی کی بات کرو
بنامِ لغزشِ پا گمرہی کی بات کرو

جلائے شمعِ تمنا ، مٹاؤ ظلمتِ شب
اجل کا نام نہ لو، زندگی کی بات کرو

اُداس اُداس زمیں ہے، دھواں دھواں ہے فلک
کہا تھا کس نے مری بےکسی کی بات کرو

پرائی آگ میں جلنا بھی کوئی جلنا ہے
لگی ہے آگ جو دل میں اُسی کی بات کرو

بہار آ تو گئی ہے ، خزاں بدوش سہی
بہا چکے بہت آنسو، ہنسی کی بات کرو

سحر کے چہرے پہ ڈالو نہ پردۂ ظلمت
ہے کیا ضرور کہ تم رات ہی کی بات کرو

جو کم نظر ہے دکھائے چراغ سورج کو
ضیا کے سامنے کیوں تیرگی کی بات کرو

(نئی دہلی اکتوبر ۱۹۶۷ء)



چلی وہ نسیمِ سحر، مسکرا دو
ستاروں کے بجھتے دیوں کو بجھا دو
نہ ہم آسرا دیں، نہ تم آسرا دو
کہاں تلخیاں غم کی جائیں، بتا دو
دھواں بھی نہ خاکسترِ دل سے اُٹھے
فغاں کی صدا قہقہوں میں دبا دو
پیتا تو ہے مجھ کو سمندر سمجھ کر
کوئی زہر بھی آنسوؤں میں ملا دو
کسی روز منزل مجھے پا ہی لے گی
جو چلتے رہے تم مرے ساتھ جا دو
لگانی تو مشکل نہیں، بات جب ہے
کہ تم میرے دل کی لگی کو بجھا دو
نبرد آزما ہے اندھیروں سے دُنیا
ضیاؔ کی غزل ہی کوئی اب سنا دو

(بمبئی جون ۱۹۶۶ء)



بھیجا پیام موسمِ گُل نے صبا کے ہاتھ
میں نے بھی دل کو سونپ دیا مدّعا کے ہاتھ

اُس بات کو نہ کوئی بھی سمجھے، خدا کرے
آنکھوں سے کہہ گئے جو وہ میرا دبا کے ہاتھ

مُرجھا کے پھول شاخوں سے ٹوٹے، بکھر گئے
جب تو وداع مجھ سے ہوا تھا ملا کے ہاتھ

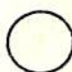
کچھ تو کمی خلوص و وفا میں ہے ورنہ کیوں
پچھتا رہے ہیں اُن کی طرف ہم بڑھا کے ہاتھ

بجلی چمک کے کالی گھٹاؤں میں کھو گئی
انگڑائی لینی چاہی تھی اُس نے اُٹھا کے ہاتھ

بے تیغ و موت مارے گئے، کچھ نہ پوچھئے
دل دے کے ہم تو ایک بُتِ بے وفا کے ہاتھ

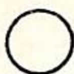
آخر تجھے سزائے گنہ مل گئی ضیا
کہتے نہ تھے کہ ہوتے ہیں لمبے خدا کے ہاتھ

(نئی دہلی جون ۱۹۸۰ء)



دُکھ درد سہہ
چپ پھر بھی رہ
ساحل سے ڈر
موجوں میں بہہ
سن لیں جیسے
وہ بات کہہ
اُلفت نبھا
ہر ظُلم سہہ
میری بھی سُن
اپنی بھی کہہ
سب چور ہیں
ہشیار رہ
اب اے ضیاؔ
کچھ بھی نہ کہہ

(بمبئی ستمبر ۱۹۶۸ء)



ڈھونڈے نہ مرا دل کسی غمخوار کا سایہ
مل جائے اگر آپ کی دیوار کا سایہ
اس اندھے کنوئیں سے تو نکل کر کوئی دیکھے
آتا ہے نظر دھوپ میں اشجار کا سایہ
زرخیز ہے مٹی اُسی شاداب زمیں کی
جس پر ہے کسی ابرِ گہربار کا سایہ
آتا ہوں میں کردو شبِ تیرہ کو خبردار
سینے میں چھپائے ہوئے انوار کا سایہ
لوٹا نہ مزہ حسنِ نظر کا کبھی اُس نے
اُترا نہ کبھی نرگسِ بیمار کا سایہ
ڈرتا ہوں کہ سُن کر مرے اشعارِ دلِ افگار
پڑ جائے نہ اُس پر غم و افکار کا سایہ
جینا بھی ہے مشکل کہ ضیاؔ رہتا ہے سر پر
ہر لحظہ لٹکتی ہوئی تلوار کا سایہ

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء)

○

آندھی خزاں کی باغ میں جب تک چلی نہ تھی
مرجھا کے شاخ سے کوئی پتی گری نہ تھی
چلتی رہیں ہزاروں حوادث کی آندھیاں
جلتی رہی وہ شمع جواب تک بجھی نہ تھی
وہ آ گئے، تو رات گئی، صبح ہو گئی
قسمت مری بگڑ کے کبھی یوں بنی نہ تھی
اک تو کہ جس نے پاسِ وفا کی نہ دی تھی داد
اک ہیں کہ جس نے ظلم کی فریاد کی نہ تھی
صد حیف دوستوں نے بھی سمجھا مجھے غلط
تھی دوستی کسی سے، مری دشمنی نہ تھی
کیا آئینہ دکھاتا میں اسرارِ زیست کو
تھی آگہی کہ مجھ کو کوئی آگہی نہ تھی
جو رات بے محابا مرے لب پہ آ گئی
میں نے ضیا وہ بات کسی سے کہی نہ تھی

(نئی دہلی دسمبر ۱۹۷۹ء)



اب اپنے آپ سے بھی محبت نہیں رہی
مرنا پڑا کہ جینے کی صورت نہیں رہی

احسانِ چارہ گر نہ اُٹھاؤں تو کیا کروں
دستِ دُعا اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی

پائے بتاں پہ رکھ کے جبیں، دل کو ہے گِلہ
غم ہائے روزگار سے فرصت نہیں رہی

حق بات کہہ کے دار کا حق دار بن گیا
اب جھوٹ کے نگر میں صداقت نہیں رہی

اس بُلبلِ اسیر پہ بہ خندہ ہائے گُل
پرواز کی بھی جس کو اجازت نہیں رہی

خم ہے ہر نیاز درِ ناز پر ہنوز
گو شہرِ دل میں شورشِ وحشت نہیں رہی

اس بھیڑ میں کسی کی بھی مجھ پر اب اے ضیاؔ
کیا قہر ہے کہ چشمِ عنایت نہیں رہی

(نئی دہلی جولائی ۱۹۷۳ء)



اب نہ وہ رُت ہے، نہ وہ جامہ دری ہے کہ جو تھی
کیا ستم ہے کہ وہی بخیہ گری ہے کہ جو تھی

ہوئی مدّت کہ بیابانوں میں تھا جشنِ جنوں
آج بھی دعوتِ شوریدہ سری ہے کہ جو تھی

گُل یگانے ہیں تو کانٹے بھی نہیں بیگانے
مگر انساں کی وہی کج نظری ہے کہ جو تھی

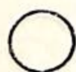
خوں چکاں دیدۂ دیدار طلب ہے کہ جو تھا
گلفشاں آج بھی بادِ سحری ہے کہ جو تھی

نہ ہوا اب بھی غلط غم تو کسے دیں الزام
سہمے خانہ وہی بیخبری ہے کہ جو تھی

حضرتِ شیخ سے اب کون کرے مفت کی بحث
سببِ تشنہ لبی، کم نظری ہے کہ جو تھی

اے ضیاؔ موت کی زردی تو مسلّم ہے مگر
زندگی آج بھی اک سبز پری ہے کہ جو تھی

(نئی دہلی اگست ۱۹۶۶ء)



بادِ بہار! اب نہ مجھے چھیڑ، مان بھی
دل دے کے اُن کو پڑ گئی مشکل میں جان بھی
جا وے ہزاروں دستکیں دیتے ہیں دربدر
اس شہرِ دل میں ہے کوئی خالی مکان بھی؟
وہ آدمی نہیں ہے جو ڈر جائے موت سے
خنجر بڑھا ہے جھوم گئے اب سینہ تان بھی
دیکھے وہی جو رکھتا ہو آنکھوں میں تابِ دید
جلوہ نزاوِ شال بھی ہے اور نہان بھی
آب و ہوا پہ دسترسِ عزم و حوصلہ
دھرتی بھی اپنے قبضے میں ہے آسمان بھی
مندر میں آ کے اُترا ہے مسجد کا کارواں
پہلو بہ پہلو بیٹھے ہیں لالہ بھی خان بھی
سیتا کے دل کا حال کہوں تجھ سے کیا ضیا
ہے رام کی کمان بھی راون کا بان بھی

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۹ء)



پیرچھائیں عیب کی تو ہنر پر پڑی نہ تھی
جب تک نہ داد تھی کوئی بیداد بھی نہ تھی

حرفِ غلط کی طرح مٹی لوحِ باغ سے
کاٹی گئی وہ شاخِ شجر جو ہری نہ تھی

پھرتا رہا میں شہر کی گلیوں میں رات بھر
تختی کسی بھی در پہ مرے نام کی نہ تھی

میں کیوں بکھر کے ہو گیا شایانِ کائنات
آواز مجھ کو میری انا نے تو دی نہ تھی

چھوتے ہی جانے دوڑ گئی کیوں رگوں میں آگ
وہ ایک شاخِ گل تھی کوئی پھلجھڑی نہ تھی

جلتے اگر نہ پاؤں تو کیا ہوتے سرخرو
پھیلی ہوئی تھی دھوپ وہاں چاندنی نہ تھی

کیا خاک قدر وقت کی ہوتی مجھے ضیا
باندھی ہوئی کلائی پہ میں نے گھڑی نہ تھی

(نئی دہلی جنوری ۱۹۸۰ء)



دلِ پُرخوں کی وفا یاد آئی
آہ کی تھی کہ دُعا یاد آئی

کس نے چھڑکا ہے زخموں پہ نمک
درد اُٹھتے ہی دوا یاد آئی

غم کا عرفان ہوا پھر دل کو
پھر مئے ہوشربا یاد آئی

توبہ کرتا تھا گناہوں سے مگر
بے گناہی کی سزا یاد آئی

حُسن کو دیکھ کے مصروفِ خرام
موجۂ بادِ صبا یاد آئی

اُن کی آمد سے ہوا تھا مسرور
اُن کے جاتے ہی قضا یاد آئی

موت کے بعد ضیاؔ اُن کو مری
یاد آئی بھی تو کیا یاد آئی

(بمبئی فروری ۱۹۶۹ء)



دل کی دھڑکن کو ملی درد کی سوغات نئی
کھنچ گئی ذہن میں تصویرِ خیالات نئی

پھر شبِ وعدہ کے قدموں کی صدا آتی ہے
دل میں پیدا ہوئی پھر شورشِ جذبات نئی

آج ہی پُرسشِ احوال کو وہ آئے ہیں
آج ہی کہنے کو کوئی بھی نہیں بات نئی

میکدہ چھوڑ کے مسجد میں چلا آیا ہوں
شاید آجائے نظر صورتِ حالات نئی

روز آئینے میں آتا ہے نظر چہرۂ نو
روز کر لیتا ہوں میں خود سے ملاقات نئی

زندگی کرنے کی یہ بھی تو ہے اک رسمِ قدیم
دل پہ لگتی ہی رہے ضربتِ صدمات نئی

اے ضیاؔ ترکِ روایت تو ہے جدّت لیکن
کشتِ جدّت میں اُگ آئی ہیں روایات نئی

(نئی دہلی اگست ۱۹۷۸ء)



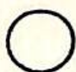
رات کہتی تھی، دل سے آنسو پی
یُونہی اُمید میں سحر کی جی
جگمگائے چراغ ذرّوں کے
پڑ گئیں ماند شمعیں تاروں کی
گُلِ نرگس ہے محوِ آئینہ
واہ رے عالمِ دروں بینی
وہ تو میں ہی تھا بارہا جس نے
زندہ رہنے کو خودکشی کر لی
کیسے احساس تھا اسیری کا
بند کھڑکی اگر نہیں کھُلتی
جل بُجھا جو پتنگا اُس کی خبر
آگ کی طرح شہر میں پھیلی
شعر کہتے رہو ضیاؔ صاحب
خدمتِ اُردو اور کیا ہوگی

(بمبئی ۱۹۶۷ء)



شوخ و گستاخ اس قدر مکھّی
اُڑ کے آ بیٹھی گال پر مکھّی
ہائے اُن کی یہ شانِ استغنا
بیٹھنے دیں نہ ناک پر مکھّی
چارہ گر سے گلہ نہیں لیکن
کس نے نگلی ہے دیکھ کر مکھّی
موسمِ برشگال ہی ہیں کیوں
بھنبھناتی ہے بیشتر مکھّی
دیکھتی رہ گئی لبِ شیریں
اُڑتی پھرتی تھی در بدر مکھّی
گھر ہے حلوائی کی دُکاں تو نہیں
جانے کیوں آگئی اِدھر مکھّی
کون تقلید لے ضیاؔ کرتا
مارتا کون مکھّی پر مکھّی

(نئی دہلی ۱۹۷۴ء)



صبح ہوئی یا شام ہوئی
پامالِ انجام ہوئی
عقبیٰ کی کیا فکر کروں
دُنیا میرے نام ہوئی
ایک اُمیّدِ ہوش جو تھی
وہ بھی نذرِ جام ہوئی
پھنس نہ سکی نکہت ہی تو تھی
گُل کی رگ رگ دام ہوئی
تھا ساقی کا خاص کرم
دعوتِ مستی عام ہوئی
چلتے چلتے رستے میں
بیٹھ گئے تو شام ہوئی
میری سعیِ حال ضیاؔ
فردا کا پیغام ہوئی

(نئی دہلی فروری ۱۹۶۵ء)



عشق کی خُو وفا نبھانے کی
حُسن کو ضد ہے آزمانے کی
ابتدا ہی نہ ہو دلِ ناداں
انتہا درد کے فسانے کی
کھو رہا ہوں کہ اس طرح بھی کبھی
نکل آتی ہے راہ پانے کی
سمٹ آئی ہے تیری آنکھوں میں
ساری مستی شراب خانے کی
سرد سردِ آہ، گرم گرم آنسو
یہ سزا غم سے دل لگانے کی
آئینہ مانگتا ہوں کس مُنہ سے
کوئی صُورت بھی ہو دکھانے کی
اے صبا کیوں قفس نہ جل جاتا
آگ تھی میرے آشیانے کی

(نئی دہلی دسمبر ۱۹۷۷ء)



کب سے آس لگائے بیٹھا دیکھ رہا ہوں راہ کسی کی
شب جتنی گھٹتی ہے، اتنی ہی بڑھتی ہے چاہ کسی کی

چھوٹ گئیں بیمار کی نبضیں، بند ہوئی دل کی دھڑکن
ہائے کس دشمن نے اڑا دی آمد کی افواہ کسی کی

کیوں چپ ہوں اس بت سے کہوں کیا نادان ہے کب سمجھے گا
لوہا بھی پگھلا دیتی ہے دل سے نکلی آہ کسی کی

دیکھا تو ہر خاک کا ذرّہ اک سورج بن کر روشن تھا
پگلا دل کہتا تھا مجھ سے کاہکشاں ہے راہ کسی کی

وقت کا رستہ تکنے والے تکتے ہی رہ جاتے ہیں
میت ہوئی ہے اور نہ ہوگی گردشِ مہر و ماہ کسی کی

صبح کی منزل تک آتے آتے ہمّت بھی چھوٹ گئی
جیسے میری رات کٹی ہے یوں نہ کٹے اللہ کسی کی

دیکھو ضیا صاحب کل کوئی اٹھ کے گیا تھا لیکن آج
یوں لگتا ہے جیسے عمریں بیتیں تکتے راہ کسی کی

(بمبئی جنوری ۱۹۶۶ء)



گلشن کی فضا مہکی، جنّت کی ہوا آئی
نغموں کی ہوئی بارش پھر کالی گھٹا آئی

پیغامِ سحر لے کر شب خانۂ دوراں میں
ہر ذرّے کو چمکاتی پھر بادِ صبا آئی

پھر شاخ پہ انگڑائی لی سوسن و لالہ نے
پھر دستِ طلب اُٹھا، پھر لب پہ دُعا آئی

پھر پائے خرد لرزا، پھر شوقِ جنوں بہکا
پھر سینے میں دل دھڑکا، پھر غم کی دوا آئی

پھر جلوت و خلوت میں پھیلی مری پرچھائیں
گردوں سے پلٹ کر پھر میری ہی صدا آئی

پھر میں ہی سزاوارِ رعنائیِ گُل ٹھہرا
کام آئی تو گلشن میں میری ہی خطا آئی

اے طبعِ ضیاؔ تو بھی اس موسمِ رنگیں میں
دیکھوں تو کہاں آئی، پھر میں نے سُنا آئی

(نئی دہلی اگست ۱۹۷۴ء)



گُل کھلے، کھول بھی دو، اب درِ زنداں کوئی
دل میں رہ جائے مرے دل کا نہ ارماں کوئی

یاد کی داد کہ رکھ دیتا ہے لا کر شبِ غم
خلوتِ دل میں مری شمعِ فروزاں کوئی

در بدر سجدے کئے جاتا ہوں، شاید کر دے
جادۂ منزلِ مقصود نمایاں کوئی

شمع کو کام ہے جلنے سے اُسے کیا معلوم
اس بھری بزم میں ہے خود سے گریزاں کوئی

توڑ دے جو سرِ منزل کا طلسمِ پندار
نظر آتا ہی نہیں تا حدِ امکاں کوئی

چھپتے سورج سے یہ بڑھتے ہوئے سایوں کی چھیڑ
شام سے رہتا ہے نالاں و پریشاں کوئی

اے ضیا اہلِ نظر کو ہیں برابر دونوں
گُلِ خنداں ہو کہ ہو خارِ مغیلاں کوئی

(نئی دہلی مئی ۱۹۸۰ء)



الٰہی ہوا پیامِ سحر، رات ہو چکی
جس بات کی تھی فکر وہی بات ہو چکی

پھر گئے ہیں اپنے ساتھ وہ سایہ مرا لئے
اب اُن سے رہ گزر میں ملاقات ہو چکی

اب تجزیہ کریں بھی تو کیا اس سے فائدہ
چلنے نہ پائے چال مگر مات ہو چکی

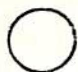
جو جانتے ہیں وہ بھی تو پہچانتے نہیں
کس درجہ مسخ صورتِ حالات ہو چکی

ذرّوں کے لب پہ اب بھی ہے احساسِ تشنگی
حالانکہ ریگزار میں برسات ہو چکی

دن ہو کہ رات دل کو دھڑکنے سے کام ہے
دُنیا میں اس طرح بسر اوقات ہو چکی

اُس کی نظر نہ مجھ پہ پڑے جب تک اے ضیا
تکمیلِ شوقِ طوفِ خرابات ہو چکی

(نئی دہلی اپریل ۱۹۸۰ء)



وسعت میں وہ خلاؤں کی آخر بکھر گئی
جو بات احتیاط کی حد سے گزر گئی

تھا ناز اپنے دیدۂ بینا پہ کس قدر
اُٹھی ہی تھی نقاب کہ تاب نظر گئی

پایا نہ دیر میں نہ حرم میں کہیں سُراغ
اپنی تلاش لے کے مجھے دربدر گئی

جب تک تھا بے شعور رہا نہ تھی عیب پر نظر
آیا شعور عزّتِ اہلِ ہُنر گئی

منزل اگر ملے تو کروں اس سے یہ سوال
کیوں میں اُدھر گیا نہ جدھر رہگزر گئی

احساس تشنگی کا کناروں کو کیا ہوا
برسات میں چڑھی تھی جو ندّی اُتر گئی

مجبورِ زندگی نہ ہو مجھ سا بھی اے ضیا
کیا جانے آتے آتے کہاں موت مر گئی

(نئی دہلی نومبر ۱۹۷۸ء)



اپنے در سے نہ بھیک جو پائے
وہ گدا مانگنے کہاں جائے

پی گیا زہر، جان کر امرت
جس کے شانوں پہ سانپ لہرائے

اس طرف دشت، اس طرف جنگل
دھوپ ہی دھوپ، سائے ہی سائے

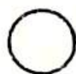
دے رہا ہوں لہو کہ کھیت مرا
اپنی شادابیوں پہ مسکائے

اجنبیت نے رکھ لیا پردہ
دل میں آنکھوں سے وہ اتر آئے

میں نے بادل سے پھول مانگے تھے
مجھ پہ آندھی نے سنگ برسائے

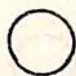
اے ضیا روشنی کا پروانہ
تیرگی کا جواز کیا پائے

([illegible] مارچ ۱۹۷۸ء)



اک بات پتنگے کی یہ مجنوں نے بتادی ہے
ہر ذرۂ صحرا نے تعلیمِ وفا دی ہے
انصاف کی رکھ دی ہے دنیا نے بنا اُس پر
ناکردہ گناہوں کی ہم کو جو سزا دی ہے
سوئی ہوئی راتوں کے جاگے ہوئے خوابوں میں
اپنی ہی صدا ہم نے سولی پہ چڑھا دی ہے
تاج اور ایلورا کی دھرتی میں نہیں کیا کچھ
کہسارِ ہمالہ ہے، کشمیر کی وادی ہے
ماضی سے جڑا ہے کیوں فردا مرا میں نے تو
بیتے ہوئے وقتوں کی ہر بات بھلا دی ہے
تابانیِ مہر و مہ سب پھیکی پڑی جس سے
گردوں سے ٹپک کر وہ تاروں نے ضیا دی ہے
اُس موجِ حوادث کو کیا کہیے ضیا جس نے
دیوار اُٹھائی تھی ساحل پہ جو ڈھا دی ہے

(دہلی جون [illegible])



انتظارِ صبحِ نَو ہے شام سے
رات کٹ جائے کہیں آرام سے

جل اُٹھے دل میں اُمیدوں کے چراغ
دی مجھے آواز کس نے بام سے

کاروبارِ زندگی چلتا رہا
اک مسلسل کوششِ ناکام سے

اور کتنی دُور ہے منزل ابھی
پُوچھتا ہوں لغزشِ ہر گام سے

کُو بکو، صحرا بہ صحرا، در بدر
ہم رہے آوارہ و بدنام سے

عشرتِ آغاز کا اندازہ کر
اے دلِ مضطر غمِ انجام سے

توڑ ہی دی ہم نے توبہ اے ضیا
تنگ آ کر گردشِ ایّام سے

(بمبئی جولائی ۱۹۶۸ء)



ایک مندر جو دِل کے اندر ہے
کسی نٹ کھٹ کا غالباً گھر ہے
موت کا خوف تھا کبھی دِل میں
رات دن زندگی کا اب ڈر ہے
حرفِ مطلب کو دُشمنی لب سے
کوئی تو زخم میرے دل پر ہے
پیٹتا ہے ڈھنڈورا جو اپنا
وہی اِس دَور کا پیمبر ہے
خار و گُل میں تمیز کیا کیجئے
دلشکن بھی ہے وہ جو دلبر ہے
وقت کے ہاتھوں اُجڑی بستی ہیں
گرتی دیوار، ٹوٹتا در ہے
اے ضیاؔ سر پھروں سے کون کہے
آدمی آدمی برابر ہے

(نئی دہلی نومبر ۱۹۸۰ء)



بادِ خزاں نہ جانے کیا رازکھولتی ہے
پھولوں کی پتیوں کو مٹی میں رولتی ہے
بے چارہ مرچکا ہے ہسنی کے نغمکدے میں
اب یادِ یارِ ناحق دل کو ٹٹولتی ہے
اے فطرتِ گلستاں تیری ستم ظریفی
کلیوں کی مسکراہٹ کانٹوں میں تولتی ہے
تکمیلِ عشق اے دل کہتے ہیں کیا اسی کو
خاموش ہم ہیں، اُن کی تصویر بولتی ہے
اے میری چشمِ گریاں آنسو ہیں تیری دولت
نایاب گوہروں کو مٹی میں رولتی ہے
بُلبل کے دل سے پوچھو، وہ عالمِ تباہی
نورس کلی چمن میں جب آنکھ کھولتی ہے
دیوانگی پہ قابو پا ہی لیا ضیا نے
ہر جنبش اُس کے لب کی اب راز کھولتی ہے

بقدرِ عزم، عمل کا جو حوصلا کرتے
تو اہتمام کسی انقلاب کا کرتے

ذرا بھی تابِ تماشائے حُسن تھی نہ جنہیں
وہ خاک جُرأتِ اظہارِ مُدّعا کرتے

نقوشِ پا پہ نہ کرتے صنم کدے تعمیر
تو ہم نمازِ محبّت کہاں ادا کرتے

ہمارا عالمِ ہستی کچھ اور ہی ہوتا
نہ کہتے اپنی اگر آپ کا کہا کرتے

لہو سے لکھتے رہے داستانِ آزادی
بقیدِ ہوش اسیرانِ شوق کیا کرتے

مسافرانِ عدم کا تھا حوصلہ ورنہ
بس ایک جست میں طے اتنا فاصلا کرتے

شعاعِ مہرِ صبوحی میں خود اُتر آتی
ضیاؔ کا نام اگر شاملِ دُعا کرتے

(نئی دہلی نومبر ۱۹۷۷ء)



بہارِ گلشن شباب پر ہے، شباب فصلِ بہار سا ہے
روش روش رقصِ رنگ و نکہت، کلی کلی پر نکھار سا ہے
فلک پہ تارے کہاں چھپے ہیں، زمیں کی شمعیں کہاں بجھی ہیں
وہی مرے دل کی دھڑکنیں ہیں، وہی ترا انتظار سا ہے
گناہ ٹھہری تھی بیگناہی، مگر ابھی تک ہے میرے دل کو
ترے غضب پر گمانِ رحمت، گمان جو اعتبار سا ہے
کروڑوں نغمے سے گونج اٹھے، ہزاروں کلیاں سی کھل گئیں پھر
تم آ گئے ہو تو باغِ دل میں خزاں کا موسم بہار سا ہے
خموش دریا ہے، باغ بھی چپ، بتائے اب کون کس سے پوچھوں
وہ موج کیا ہے جو تیغ سی ہے، وہ پھول کیا ہے جو خار سا ہے
نہ جانے شکوہ سرائے ہستی ہوں کس لیے صبح و شام پھر بھی
تری توجہ کی کیا کمی ہے، ترا تغافل بھی پیار سا ہے
نہ جاؤ گستاخیوں پر اس کی، کرو نہ اس کا حساب عصیاں
ضیاؔ لئے جرعہ کشِ محبت سے بڑھ کے بھی کوئی پارسا ہے

(نئی دہلی اکتوبر ۱۹۷۷ء)



یاد بیتے ہوئے لمحوں کی دلاتا ہے مجھے
رات کے پچھلے پہر کون جگاتا ہے مجھے

محفلِ شوق میں جانباز پتنگوں کے لئے
شمع کا جلنا سرِ شام جلاتا ہے مجھے

جانے وہ دامنِ دل پر مرے کب ٹپکے گا
اشکِ خوں، جو تری پلکوں پہ بٹھاتا ہے مجھے

چاندنی ہے مرے آنگن میں کبھی، دھوپ کبھی
جانے کیوں سایہ مرا پھر بھی ڈراتا ہے مجھے

آنکھ سورج سے ملالوں تو غنیمت جانوں
میرا مقصودِ نظر کب نظر آتا ہے مجھے

اس پہ پڑ جاتا ہے پردہ جو میں ہوتا ہوں عیاں
اور ہوتا ہے وہ ظاہر تو چھپاتا ہے مجھے

خودنمائی کا تقاضا ہے ضیاؔ جی ورنہ
آئینہ میرا ہی کیوں عکس دکھاتا ہے مجھے

(دنئی دہلی جنوری ۱۹۸۰ء)

بے نیازانہ گزر جائیں گُل و گلزار سے
ربط اتنا آبلہ پائی کو نوکِ خار سے؟
کیا ہوئی وہ شورشِ ہنگامۂ محشر نژاد
کیوں ٹپکتی ہے اُداسی سی درودیوار سے
کر رہا ہوں اپنے خونِ دل کے قطروں کا شمار
سرخیاں دو چار لے کر آج کے اخبار سے
جھانکتی ہے صبح نو چاکِ گریباں سے مرے
آشیاں کرتا ہوں روشن برقِ شعلہ بار سے
آج بھی حق بات کہنے پر ہے پابندی وہی
آج بھی ہم کو تعلق ہے صلیب و دار سے
ہو کے ظاہر کر گیا بیگانۂ ہوش و حواس
حُسن کیا پردوں میں چھپتا طالبِ دیدار سے
اے ضیا بڑھتا ہی جاتا ہے شبِ غم کا ہراس
مانگ کر سایہ خجل ہوں سربلند اشجار سے

(نئی دہلی مارچ ۱۹۷۹ء)



پردہ چہرے سے اُٹھا رکھا ہے
کھُلی آنکھوں پہ گرا رکھا ہے
وہ دلوں میں ہے نہ بازاروں میں
نام جس شے کا وفا رکھا ہے
میری آنکھوں میں بھی آنکھیں ڈالو
آئینہ خانوں میں کیا رکھا ہے
آمدِ جشن ہے کیا، آنگن میں
شور کوؤں نے مچا رکھا ہے
جھوٹ کے شہر کی خوش فہمی نے
سچ کو سولی پہ چڑھا رکھا ہے
کون پہچانے کسے، سب نے یہاں
چہرہ چہرے پہ لگا رکھا ہے
اِن دھڑکتے ہوئے شعروں میں ضیا
اور کیا دل کے سوا رکھا ہے

(لکھنؤ اکتوبر ۱۹۸۰ء)



پنچھی بیٹھا ہے پر تولے
کوئی آ کر پنجرا کھولے

جینا ہی ٹھہرا تو اے دل
صبح نہیں تو شب کا ہو لے

کس کو فرصت ہے دنیا کے
سربستہ رازوں کو کھولے

امرت میں بس گھول رہے ہیں
کوئی بس میں امرت گھولے

سورج بھی چند جا جائے گا
ذرّہ اپنی آنکھ تو کھولے

پیاس بجھاؤں پی کر آنسو
بھوک مٹاؤں کھا کر چھولے

آتی رہے گی موت ہنسیا، تو
ہستی کے رستے پر ہو لے

(بمبئی مئی ۱۹۶۷ء)



پھیلا جو قطرہ ، موجۂ طوفاں ہوا تو ہے
جوشِ نمو سے ذرّہ بیاباں ہوا تو ہے
پھر بال و پر کو ہمّتِ پرواز مل گئی
پھر سازگارِ عالم امکاں ہوا تو ہے
پھر حدِّ احتیاط سے دستِ طلب بڑھا
پھر تار تار دل کا گریباں ہوا تو ہے
اب بھی اگر نہ آؤ تو میں تم سے کیا کہوں
روشن چراغِ خوں سرِ مژگاں ہوا تو ہے
بازارِ زندگی میں ہے جنسِ وفا گراں
انسان کا لہو مگر ارزاں ہوا تو ہے
اے میرے ناخدا مجھے دریا میں ڈوب کر
اندازۂ تلاطم و طوفاں ہوا تو ہے
گُل کھل کے ایک پل کے لئے ہی سہی ضیا
غمخانۂ حیات میں شاداں ہوا تو ہے

(نئی دہلی نومبر ۱۹۷۹ء)



تڑپ سے دل کی ہے عاری جو زندگی کیا ہے
نہ ہو خلوص و محبت تو آدمی کیا ہے

ذرا نگاہِ قیامت اثر اُٹھا دیکھو
ضرورت آپ کو خنجر کی، تیغ کی کیا ہے

کسی کو تیرا تجسّس، کسی کو اپنی تلاش
بتائے کون خودی کیا ہے، بیخودی کیا ہے

حیاتِ نو دلِ مُردہ کو بخشنے والا
دراصل دستِ مسیحا ہے، درد بھی کیا ہے

کھنکتے جاموں میں سُنتا ہوں دھڑکنیں دل کی
نظر نظر کا تصادم ہے، نغمگی کیا ہے

ہر ایک شعر کسی دُکھتی رگ کا ہے نبّاض
ہے دل سے نکلی ہوئی آہ، شاعری کیا ہے

ضیا کے پاس ضیا کی تلاش لائی تھی
مگر یہاں بھی اندھیرے کی لٹ کھلی کیا ہے



(نئی دہلی اکتوبر ۱۹۸۰ء)



تصویر کا ہر رنگ نمایاں نہ کریں گے
ہم شوق کی رُسوائی کا ساماں نہ کریں گے

لائے تو ہیں بازار میں دل بیچنے والے
یہ جنسِ گراں ہے اسے ارزاں نہ کریں گے

تم بھی نہ کرو وسعتِ صحرا کا مداوا
ہم بھی گلۂ تنگیِ داماں نہ کریں گے

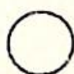
بربادیِ گلشن سے کہاں جائیں گے بچ کر
آباد اگر گوشۂ زنداں نہ کریں گے

رہ جائیں گے محروم وہ ساحل کے سکوں سے
جو پرورشِ شورشِ طوفاں نہ کریں گے

کیوں زخمِ حوادث کو یہی ضد ہے ابھی تک
ظلمت کدۂ دل میں چراغاں نہ کریں گے

ہیں متفق اب اس پہ ضیا اپنے پرائے
ہمدرد کبھی درد کا درماں نہ کریں گے

(نئی دہلی اپریل ۱۹۷۹ء)



تنہائی کا سکوت صدا آشنا تو ہے
ظاہر نہیں مگر کوئی مجھ میں چھپا تو ہے

حیراں ہوں پھر بھی تیری دوا کارگر نہیں
اے چارہ ساز، میرے لبوں پر دُعا تو ہے

اب راکھ رہ گئی ہے دلیلِ اُمیدِ صبح
اس انجمن میں شب کی مرا دل جلا تو ہے

دو ساحلوں کے بیچ میں، اے بعدِ مستقل
دریا لہو کا صدیوں سے بہتا رہا تو ہے

کر لے خراجِ سجدہ جبینوں سے جو وصول
میرے صنم کدے کا وہی بت خدا تو ہے

میں بھی شبِ حیات کے گیسو سنوار لوں
سورج کے دستِ شوق میں اب آئینا تو ہے

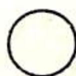
جشنِ غزل سرائی میں تعویق کس لئے
کوئی نہیں ہے بزمِ سخن میں ضیا تو ہے

(نئی دہلی نومبر ۱۹۷۹ء)



تھپیڑے ہم امواج کے سہتے سہتے
کنارے پہنچ جائیں گے بہتے بہتے
چلو اب نئی دُنیا آباد کر لیں
کہ جی بھر گیا ہے یہاں رہتے رہتے
فریبِ تلاشِ نشاطِ سکوں میں
کٹی عمر رنج و الم سہتے سہتے
کسی روز دنیا سے اُٹھ جائیں گے ہم
فسانہ غمِ عشق کا کہتے کہتے
مسرّت کا احساس بھی اب نہیں ہے
ہُو حال دل کا یہ غم سہتے سہتے
ہمیں آخر کار نیند آ چلی تھی
وہ کیوں رُک گئے داستاں کہتے کہتے
ترستی ہیں اب قطرۂ خوں کو آنکھیں
ضیاؔ خشک دریا ہوا بہتے بہتے

(دہلی ستمبر ۱۹۴۶ء)



جلوہ آباد جب آغوشِ نظر ہوتی ہے
دیکھنے والے کو کب اپنی خبر ہوتی ہے

سلسلہ طولِ شبِ غم کا کہیں ختم بھی ہو
ورنہ ہونے کو تو ہر روز سحر ہوتی ہے

کون جانے کہ نہیں پردۂ تشکیلِ خورشید
شورشِ زیست بعنوانِ دگر ہوتی ہے

نظر آتا نہیں در کوئی ترے در کے سوا
تو جدھر ہوتا ہے دنیا بھی اُدھر ہوتی ہے

شمع جلتی ہے بھری بزم میں شب بھر لیکن
تہمتِ عشق تو پروانے کے سر ہوتی ہے

انتہا غم کی ہے آغازِ نشاطِ مستی
حد سے بڑھ جاتی ہے جب رات سحر ہوتی ہے

اے ضیاؔ حسنِ توجہ کی قسم، ہونے دو
دل کی رسوائی زمانے میں اگر ہوتی ہے

(نئی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء)



جنوں بھی ہے، جمال بھی، جبیں بھی آستاں بھی ہے
کہاں ہے اشتیاقِ سجدہ؟ اُس کا کچھ نشاں بھی ہے؟
دیارِ حُسن و نُور میں تلاشِ عشق ہے مُجھے
کہ زلف و رُخ کی داستاں ہی دل کی داستاں بھی ہے
جہاں ہے پھول کی ہنسی، وہیں ہے خار کی چُبھن
دلوں کے کاروبار میں تو سُود بھی زیاں بھی ہے
چلیں قدم سے اب قدم ملا کے راہِ شوق میں
یہ میرا امتحاں نہیں، یہ اُن کا امتحاں بھی ہے
کرن کرن امید و شوق، سایہ سایہ یاس و غم
دلِ جنوں نواز کو یقیں بھی، ہے گُماں بھی ہے
رہِ فرار ہے کدھر، کہاں چھپاؤں اپنا سر
زمیں کو بیر ہے اگر تو دُشمن آسماں بھی ہے
ضیاؔ وہ عیب جُو نہیں، یہ راز جس نے پالیا
کہ حُسن ہے وہاں وہاں نگہ جہاں جہاں بھی ہے

(نئی دہلی، ستمبر ۱۹۷۹ء)



جو سمجھنا تھا ہمیں وہ ہم کہاں سمجھا کئے
راہزن کو ہی امیرِ کارواں سمجھا کئے

خشک آنکھیں ہو گئیں رو رو کے جن کی رات بھر
وہ ہر اک قطرے کو بحرِ بیکراں سمجھا کئے

گردشِ ایام سمجھاتی رہی رازِ حیات
ہم سمجھنے کی طرح لیکن کہاں سمجھا کئے

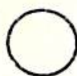
تھا ہمیں پاسِ وفا کرتے بھی اُن سے کیا گلہ
دردِ دل کو باعثِ آرامِ جاں سمجھا کئے

جام آتے ہی رہے گردش میں روز و شب مگر
تشنہ لب ہی کچھ غمِ تشنہ لباں سمجھا کئے

ہم میں تم میں ربطِ باہم تھا ازل سے اسلئے
حُسن کو تم عشق کو ہم جاوداں سمجھا کئے

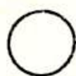
یہ ہماری سادہ لوحی تھی کہ کج فہمی ضیاؔ
خارزارِ زندگی کو گلستاں سمجھا کئے

(نئی دہلی جولائی ۱۹۷۳ء)



چاکِ دامن کا بھرم رکھ لیا رُسوائی نے
اوڑھ لی غم کی ردا درد کے شیدائی نے
شوق کے جادۂ پُرپیچ کو اے پائے جنوں
کیا ہموار تری حوصلہ افزائی نے
شبنمی قطروں کا یہ رقص ہرے پتوں پر
دل کے زخموں کو نہ بھرنے دیا پُروائی نے
دم بدم بڑھتی ہوئی بھیڑ اس رہنے نہ دیا
غمِ تنہائی کا احساس بھی تنہائی نے
ہائے کب کھولے ہیں یادوں کے دریچے دل میں
اجنبی گاؤں کی بجتی ہوئی شہنائی نے
سلوٹیں بستر راحت کی بنیں نشترِ غم
دیا پیغامِ سحر رات کی انگڑائی نے
آڑے آئی ہے نہ ہی مشقِ سخن ورنہ ضیا
کہلوائی ہے غزل قافیہ پیمائی نے

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء)



حادثوں کی دین ہے یہ آگہیِ دل مجھے
میں ہی تھا خود اپنی منزل، مل گئی منزل مجھے

وہ شناور ہوں کہ سُن کر ڈوب جانا ہی پڑا
موجِ طوفاں کی زباں سے نالۂ ساحل مجھے

کل جو طعنِ گمرہی دیتے تھے، وہ دیکھیں کہ آج
ہر قدم پر دوڑ کر لیتی ہے خود منزل مجھے

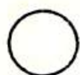
چُپ رہا میں بھی کہ بن مانگے ہی جھولی بھر گئی
خوش رہا وہ بھی کہ بخشی کائناتِ دل مجھے

میں سنواروں گیسوئے ہستی مگر اے دل بتا
تیری وحشت نے کہاں رکھا کسی قابل مجھے

یہ ہجومِ یاس و غم، یہ عالمِ بیم و رجا
اے خدا پتھر دیا ہوتا بجائے دل مجھے

میری شوریدہ سری کو کون سمجھے گا ضیاؔ
بہرِ سجدہ مل گیا ہے آستانِ دل مجھے

(بمبئی ۱۹۶۷ء)



حسن کی بارگاہ میں آگ بھی ہے دھواں بھی ہے
عشق کے کاروبار میں سود بھی ہے زیاں بھی ہے

بیم بھی ہے رجا بھی ہے، وہم بھی ہے گماں بھی ہے
درد و الم کی بھیڑ میں دل کا کہیں نشاں بھی ہے؟

کون سنے گا دھڑکنیں تیری دیارِ غیر میں
اے دلِ دردآشنا، حوصلۂ بیاں بھی ہے؟

درد اساسِ کائنات، درد بنائے زندگی
درد دل و جگر میں ہے، درد یہاں وہاں بھی ہے

ڈھونڈ رہے تھے ہم جسے، رام وہ مل گیا مگر
تیر کا کچھ پتہ نہیں، ٹوٹی ہوئی کماں بھی ہے

میرے وجود پر زمیں رقص کناں و نغمہ خواں
میرا وجود باعثِ گردشِ آسماں بھی ہے

چل کے اُسی سے کہہ نہ دوں حالِ دل اپنا اے صبا
وہ مرا ہمنوا بھی ہے، وہ مرا ہمزباں بھی ہے

(نئی دہلی نومبر ۱۹۸۰ء)



(ذو قافیہ)

خود پرستی شباب کی سی ہے
کیف و مستی شراب کی سی ہے

موت کا انتظار شام و سحر
فکرِ ہستی عذاب کی سی ہے

میری تقدیر کی کتابت بھی
کسی ستی کتاب کی سی ہے

دھول خوابوں کی آنکھ کا کاجل
دل کی بستی سراب کی سی ہے

شہرِ نغمہ کا زیر و بم، توبہ
اوج و پستی رباب کی سی ہے

زیر دستوں کی یہ زبوں حالی
چیرہ دستی عتاب کی سی ہے

پار اُترنا ہے ڈوب کر ہی غنیا
رودِ ہستی چناب کی سی ہے

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء)



دستک یہ کون دیتا ہے، دروازہ کھولئے
جھونکا نسیمِ صبح کا ہے، آنے دیجیے

اپنی خبر ہی ہم کو بھری بزم میں نہیں
تنہائیوں کا ذکر ہے کیوں یہ نہ پوچھیے

کچھ تھا مری انا کا تقاضا کچھ ان کی ضد
کرتا رہا گناہ، وہ جب تک گنا کئے

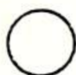
بجھتی نہیں ہے آگ پتنگوں کی تا ابد
جلتی ہے شمعِ بزم بس اک رات کے لئے

کرتا ہے وقتِ شب کے اندھیروں میں دم بدم
بجھتے ہوئے چراغوں سے روشن نئے دیئے

دنیا سے بیر، دین سے نفرت، خدا کا خوف
جینا ہی ہے تو اس طرح کب تک کوئی جئے

اب مانگنے پہ موت بھی آتی نہیں ضیا
کیوں زندگی ملی تھی بغیر التجا کئے

(بمبئی اپریل ۱۹۶۸ء)



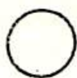
دل حادثاتِ دہر کا شکوہ گزار ہے
ناآشنائے گردشِ دلیل و نہار ہے
غنچے چٹک رہے ہیں عنادل ہیں نغمہ خواں
آمد کسی کی آمدِ فصلِ بہار ہے
بجلی چمک کے چھپ بھی گئی غارِ ابر میں
اے چشمِ شوق کس کا تجھے انتظار ہے
ڈر ہے کہ ہو نہ تیشۂ فرہاد سرنگوں
ہر سمت ایک سلسلۂ کوہسار ہے
بدلی برس چکے گی تو چمکے گی تیز دھوپ
کیا غم اگر خزاں بھی شریکِ بہار ہے
ملتا ہے پھل اسی کو جو خود بڑھ کے توڑ لے
یہ کائنات اِک شجرِ سایہ دار ہے
کر داغہائے دل کا شمار اے ضیا نہ پوچھ
باقی ہنوز کتنی شبِ انتظار ہے

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۳ء)



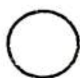
دل کے آنگن میں عجب شور مچا رکھا ہے
آسماں سر پہ ہواؤں نے اٹھا رکھا ہے
گھر کے آئی ہے گھٹا، تو یہ نشکن ہے موسم
اک نئی پیاس نے دیوانہ بنا رکھا ہے
حشر بن کر ہی تم آجاؤ کسی روز ادھر
ہم نے دروازۂ دل کب سے کھلا رکھا ہے
گھر مرا بھول نہ جائے کہیں طوفانی ہوا
اس لئے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے
دیکھتا ہوں کوئی پتھر، تو سمجھ لیتا ہوں
میرا ہی، حوصلۂ لغزش پا رکھا ہے
اپنا چہرہ کبھی دیکھوں تو وہ آجائے نظر
عکس جو آئینۂ دل میں چھپا رکھا ہے
تم صبا کہہ کے پکارو کہ مجھے مہر کہو
ایک ہی بات ہے اب ناموں میں کیا رکھا ہے

(نئی دہلی جولائی ۱۹۸۰ء) — مہر لال



دل کے ہر داغ کو بے عیب ہنر جانا ہے
شُود کو اہلِ محبّت نے ہنر جانا ہے
سالہا سال کیا دل کی تمناؤں کا خُون
جب کہیں ہم نے تجھے دیدۂ تر جانا ہے
سادگی دیکھ محبّت کی، دلِ زار، نہ پُوچھ
نظرِ حُسن کو کیوں حُسنِ نظر جانا ہے
فائزِ منزلِ مقصود وہی ہے جس نے
کہکشاں کو بھی تری راہگزر جانا ہے
بجلیاں جس پہ گریں، رات کی تاریکی میں
اُسے دل سوختہ نے اپنا ہی گھر جانا ہے
دیکھ لیں، یا نہ اُسے دیکھیں بہرحال ہمیں
منظرِ ستانِ چمن سے تو گزر جانا ہے
اے ضیا آگ کے دریا سے گزرنا ہوگا
شام کو شام، سحر کو جو سحر جانا ہے

لہ باندازِ محشر بنشاں (نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء)



رقص میں ساغرِ شراب آئے
آئے پھر موسمِ شباب آئے

پھر نہ ہو انقلاب کی اُمید
کوئی ایسا بھی انقلاب آئے

تا درِ شوق سجدے کرتا ہوا
پھر دلِ خانماں خراب آئے

کیا ہو مشرق سے آفتاب طلوع
بام پر جب وہ ماہتاب آئے

چاک داماں و خانماں برباد
وہ سوالی جو لاجواب آئے

فصلِ گل، دورِ جام عہدِ شباب
بے حجابی کو کیا حجاب آئے

رات بیدار ہے ضیا کوئی
صبح بردوش، مستِ خواب آئے

(نئی دہلی جون ۱۹۷۵ء)



زمانے کو جیتا تو ہم خود سے ہارے
کھڑے ہیں سرِ راہ کپڑے اتارے
یہ بے نام انجانے چہرے ہی چہرے
اب اس بھیڑ میں کوئی کس کو پکارے؟
جگاتا رہوں غم کے جذبات کب تک
اُگاتا رہوں اپنی پلکوں پہ تارے
وہ ٹپکا ہوا قطرۂ اشک جس کو
بہانے چلے وقت کے تیز دھارے
دو رنگی میں بھی شانِ یکرنگی ایسی
وہی سنگریزے، وہی ماہ پارے
بڑی پُرشکن عشق کی رہگزر تھی
کوئی ساتھ چلتا بھی کب تک ہمارے؟
ضیا اب کوئی موج ایسی بھی اُٹھے
ملا دے جو دریا کے دونوں کنارے

(نئی دہلی اگست ۱۹۷۹ء)



عشق پھر اپنا ہی جویا ہے خُدا خیر کرے
دل ترے کوچے میں کھویا ہے خُدا خیر کرے

کون اب میرے سفینے کا لگائے گا سُراغ
ناخداؤں نے ڈبویا ہے خُدا خیر کرے

یہ اُسی کی ہے خلش، خار جو اُن پلکوں نے
دل کے پہلو میں چبھویا ہے خُدا خیر کرے

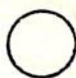
کٹ گئی آنکھوں ہی آنکھوں میں شبِ غم جس کی
وہ سحر ہونے پہ سویا ہے خُدا خیر کرے

بانجھ دھرتی میں تری لے دلِ مُردہ ہم نے
بیج اُمید کا بویا ہے خُدا خیر کرے

قیس و فرہاد کہاں، تازہ ہوس کاروں نے
عشق کا نام ڈبویا ہے خُدا خیر کرے

پھر بہار آئی ہے، پھر شعلہ و شبنم کو ضیا
ایک رشتے میں پرویا ہے خُدا خیر کرے

(نئی دہلی جون ۱۹۷۹ء)



قطرے قطرے میں چھلکتے ہیں سمندر کتنے
ذرّے ذرّے میں چھلکتے ہیں سمن بر کتنے

منتظر پردہ کشائی کے ہیں دیدار طلب
بھیگی پلکوں پہ سجائے ہوئے منظر کتنے

میں نے پہچان لیا ہاتھ سے جانے نہ دیا
وقت آیا ہی کیا بھیس بدل کر کتنے

طرح میخانہ بھی رکھ دونگا، یہ معلوم تو ہو
مسجدیں کتنی ہیں اس شہر میں بت گھر کتنے

دل جلی شاخ پہ جس پر نہ نشیمن ہے نہ گل
دم بخود بیٹھے ہیں لب بستہ نواگر کتنے

دشمنوں کا ہو بھلا، یہ بھی نہ پوچھا اب تک
زخم اپنوں نے دیئے اے دل مضطر کتنے

شب پہ الزام جو دھرتے ہیں، بتائیں تو ضیا
پُر شکن پائے گئے صبح کو بستر کتنے

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۸ء)



کام کرنے کو جو آئے ہیں وہ کر جانا ہے
جینے والوں کو کسی روز تو مر جانا ہے
راہِ خورشید وہ کیا دیکھ رہا ہے جس کو
دھوپ میں اپنی ہی پرچھائیں سے ڈر جانا ہے
سجدے کرنے چلے جاتے ہیں رہِ الفت میں
ہم نے ہر نقشِ قدم کو ترا در جانا ہے
سر میں سودائے صداقت لئے لے پائے جنوں
منزلِ دار پہ بے خوف و خطر جانا ہے
اُس مسافر کو نہ منزل کا نہ رہبر کا پتہ
جس نے آغاز کو انجامِ سفر جانا ہے
روکتی ہے ہمیں دھرتی تو بلاتا ہے فلک
جی نہیں چاہتا جانے کو مگر جانا ہے
میرا جینا بھی ہے کس کام کا میں نے تو صبا
شجرِ زیست کو بے برگ و ثمر جانا ہے

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء)



کاوشِ رہبراں سے ٹکرائے
ہمقدم کہکشاں سے ٹکرائے

میں وہ آئینہ ہوں کہ عکس مرا
جلوۂ مہ وشاں سے ٹکرائے

ہوشمندی یہی تو ہے کہ بشر
مستیٔ جاوداں سے ٹکرائے

جلوہ بینی، بہ قدرِ ذوقِ نظر
پردۂ درمیاں سے ٹکرائے

کہاں طوفاں جو سر اٹھا کر اب
موجِ آبِ رواں سے ٹکرائے

جس کی انجام پر نظر ہو وہی
فکرِ سُود و زیاں سے ٹکرائے!

بے پرواز اے ضیا! کب تک
کوششِ رائیگاں سے ٹکرائے

(نئی دلی نومبر ۱۹۸۰ء)



کشتی کی شکستہ حالی پر ملّاحوں کے دل بیٹھ گئے
بڑھتے طوفاں کے رستے میں حائل تھے جو ساحل بیٹھ گئے
کچھ کام نہ آیا عزم جواں، ہمت کا بھی دامن چھوٹ گیا
یارانِ سفر چلتے چلتے تھک کر سرِ منزل بیٹھ گئے
سونا میخانہ، چپ چپ مینا، پیمانہ تہی، توبہ توبہ
آنکھیں کیا پھیریں ساقی نے لب خشک ہوئے، دل بیٹھ گئے
بازو کی قوت نے ٹکڑے ٹکڑے دھرتی کے کر ڈالے
کچھ لوگ اٹھے، اپنی اپنی لے کر حدِ فاصل بیٹھ گئے
ہنگامہ ہستی ساحل پر دھڑکن سے بپا کرتی تھی دیں کے
وہ دل جو ڈبو کر کشتی کو طوفاں کے مقابل بیٹھ گئے
تاریکی شب کافور ہوئی، انوارِ سحر پھیلے ہر سُو
اک چشم تماشا کیا اٹھی، سب پردہ حائل بیٹھ گئے
جاتے تو کہاں جاتے وہ ضیاؔ، مارے مارے پھرتے کب تک
وابستہ امیدیں تھیں جس سے اس در پہ سائل بیٹھ گئے

(نئی دہلی اکتوبر ۱۹۷۸ء)



کہتے ہیں جس کو حاصلِ مے خانہ کون ہے
توڑے ہیں جس نے توبہ و پیمانہ کون ہے
بے گانگی میں کس کی ہے رنگِ یگانگی
اپنا جو ہو سکا نہ، وہ دیوانہ کون ہے
جز موج کیا ہے سلسلۂ ابرِ کوہسار
جز شمع، حسرتِ دلِ پروانہ کون ہے
مستی وہ کیا کہ جس میں ہو مستی کی بھی خبر
میں کیا بتاؤں ساقیِ مے خانہ کون ہے
پلکوں پہ میری خواب سجا کر تمام رات
کہتا ہے مجھ سے جو مرا افسانہ کون ہے
ہر عکسِ آئینہ سے اب آئینہ خانے میں
دیوانہ پوچھتا ہے کہ دیوانہ کون ہے
دیوانہ کہہ کے اس نے اُٹھا تو دیا صبا
اب مجھ سا بزمِ دہر میں فرزانہ کون ہے

(نئی دہلی جون ۱۹۸۰ء)



کھلیں جو پھول تو خاروں کی بات ہوتی ہے
خزاں جب آئے بہاروں کی بات ہوتی ہے
دلِ فلک بھی لرز جاتا ہے جسے سُن کر
وہ تیرے سینہ فگاروں کی بات ہوتی ہے
دلوں میں لیتی ہے انگڑائی یادِ گلبدناں
لبوں پہ لالہ عذاروں کی بات ہوتی ہے
ہر ایک ذرّہ ہے رشکِ صد آفتاب مگر
ہنوز چاند ستاروں کی بات ہوتی ہے
وہاں بھی ہوتا ہے ذکرِ شراب و جام و سبُو
یہاں بھی بادہ گساروں کی بات ہوتی ہے
بچانے والے سہارے ہی ڈوب جائیں تو پھر
ڈبونے والے کناروں کی بات ہوتی ہے
ضیاؔ قریب جب آتے ہیں دو دھڑکتے دل
نظر نظر کے اشاروں کی بات ہوتی ہے

(نئی دہلی مارچ ۱۹۷۷ء)



کہیں یہ جبہ سائی سعیِ لا حاصل نہ بن جائے
کسی کا کاسۂ سر، کاسۂ سائل نہ بن جائے

نہ روک اے لغزشِ پا، بیٹھ کر پھر کون اٹھا ہے
رہِ پُر پیچ کا یہ موڑ ہی منزل نہ بن جائے

اُمیدیں، آرزوئیں، حسرتیں، یادیں، مناجاتیں
سکوتِ خلوتِ دل، شورشِ محفل نہ بن جائے

اُبھر آتے ہیں تازہ زخم، زخمِ کہنہ بھرنے تک
مسیحا وقت کا خنجر بکف قاتل نہ بن جائے

نہاں خانے میں دل کے قید کر رکھتا ہوں ہر جلوہ
کسی کا آئینہ عکسِ مہِ کامل نہ بن جائے

تڑپ کیوں دل میں جاگے کیوں رگِ غنچہ پھڑک اُٹھے
محبت کی نئی آسانی اگر مشکل نہ بن جائے

کیا پر نوچ کر آزاد، کوشش تھی ضیا اس کی
کوئی مرغِ قفس پرواز کے قابل نہ بن جائے

(نئی دہلی مئی ۱۹۷۷ء)



گلے فلک سے نہ بڑھ کر اگر سحاب ملے
کسی کو تیرا پتا کیا دلِ خراب ملے

خرد سے زلفِ محبت سلجھ سکی نہ کبھی
دیارِ شوق میں دیوانے کامیاب ملے

وہ اک نگاہ کہ سو حشر کر گئی برپا
یہ ایک دل کہ جیسے زخم بے حساب ملے

قدم بڑھا کے کہاں تک چلیں گے ساتھ مرے
وہ ہمسفر جو سرِ جادۂ شباب ملے

وہ اور ہوں گے، ہیں کانٹے ہی جنکی قسمت میں
گئے جدھر بھی ہمیں تو اُدھر گلاب ملے

پیالہ زہر کا پہنچا ہمارے ہونٹوں تک
دعا بہ لب تھے کوئی ساغرِ شراب ملے

اُسے تلاش ہو کیا سایۂ شجر کی صبا
جھلستی دھوپ میں جو دشت محوِ خواب ملے

(نئی دہلی فروری ۱۹۷۸ء)



گو رنگ ہزاروں فلکِ پیر کے بدلے
تقدیر نہ لی مانگ کے تدبیر کے بدلے

ہاتھ آئی محبت کی جنوں گاہِ طلب میں
طولانیِ شب زلفِ گرہ گیر کے بدلے

مدت ہوئی چاہا تھا تجھے مجھ سے ابھی تک
لیتا ہے زمانہ اسی تقصیر کے بدلے

نالے کو مرے تا درِ محبوب بہت ہے
مل جائے رسائی ہی جو تاثیر کے بدلے

دوڑاتا ہوں کاغذ پہ میں الفاظ کے گھوڑے
ہاتھوں میں قلم ہے مرے شمشیر کے بدلے

بھولے سے کبھی جاتا نہیں اس شہرِ خرد میں
تحقیر جہاں دل کی ہو توقیر کے بدلے

دیوانوں کو خوش آیا ضیا موسمِ گل میں
یہ دامِ جنوں حلقۂ زنجیر کے بدلے

(احمد آباد نومبر ۱۹۶۶ء)



مے خانے میں رات ہو گئی ہے
تدبیرِ نجات ہو گئی ہے

بن کر جو دعا لبوں پر آئی
مقبول وہ بات ہو گئی ہے

کیوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اب تک
سو جاؤ کہ رات ہو گئی ہے

آئے کہ نہ آئے میرے لب پر
آنکھوں سے تو بات ہو گئی ہے

وہ مجھ کو مٹا کے کیوں نہ خوش ہوں
تکمیلِ حیات ہو گئی ہے

ذرّات کی سوز آفرینی
صورت گرِ ذات ہو گئی ہے

سمجھے گا اب اس کو اے ضیا کون
در پردہ جو بات ہو گئی ہے

(ناگپور مارچ ۱۹۷۶ء)



مے کشی کا لطف تو پی کر بہک جانے میں ہے
دیر کیا اے ساقیِ گلشن بہار آنے میں ہے

خندۂ گل، نغمۂ بلبل سے کیا اس کو غرض
جو ازل سے مضطرب ذہنیت کے غمخانے میں ہے

پی رہا ہوں، پی ہی لوں گا، ذوقِ مے نوشی بجبر
تلخ و شیریں ساقیا جیسی بھی پیمانے میں ہے

لامکاں آخر مکاں کی قید میں آجائے گا
کوئی مسجد میں نہ لا سکتی کوئی بتخانے میں ہے

میرے دردِ دل کی اُسکی کج ادائی کی قسم
ہے تڑپنے میں مزا تو لطف تڑپانے میں ہے

میں خزاں میں بھی کہاں ہوں فصلِ گل سے بیخبر
ایک تنکا اب بھی باقی میرے کاشانے میں ہے

سُن تو لوں میں ، ان کی باتیں سننے کا حاصل تو ہو
اے صبا کوئی اثر ناصح کے سمجھانے میں ہے؟



نکہتِ گل، خلشِ خار کہاں تھی پہلے
زندگی اتنی گراں بار کہاں تھی پہلے

نہ سہی دل، مگر آنکھیں تو ملا کرتی تھیں
بیچ میں آہنی دیوار کہاں تھی پہلے

دیدہ و دل پہ کیا سحر ترے جلووں نے
تیرگیٔ شب کی پُراسرار کہاں تھی پہلے

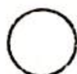
سردمہریٔ خریدار کو دیتا ہوں دُعا
ورنہ یہ گرمیٔ بازار کہاں تھی پہلے

غمِ عشرت میں یہ اُلجھی ہوئی دل کی دُنیا
عشرتِ غم کی سزاوار کہاں تھی پہلے

شکریہ، بازیٔ اُلفت کی فسوں کاری کا
جیت سے بڑھ کے مری ہار کہاں تھی پہلے

اے صبا خوب نہیں تنگیٔ افکار و لغات
تیرے اشعار میں یہ بات کہاں تھی پہلے

(نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۰ء)



وہ پاکباز جو بادہ کشی کا دم بھرتے
نہ بھول کر بھی کبھی شیخ جی کا دم بھرتے

جیو، کہ موت کو آنا ہے آ ہی جائے گی
امر ہوئے جو برے زندگی کا دم بھرتے

اٹھو کہ دامنِ شب تار تار کر ڈالیں
ملے گا نور کہاں تیرگی کا دم بھرتے

تری نگاہِ کرم بھی تھی شاملِ تخلیق
تو پھر فرشتے نہ کیوں آدمی کا دم بھرتے

یہ اہلِ عشق کی مستی کہاں اماں پاتی
جو اہلِ حسن فقط بے رُخی ہی کا دم بھرتے

قریبِ منزلِ مقصود کھل گیا ہوتا
جو رہنما نہ مری گمرہی کا دم بھرتے

نجوم و ماہ، ضیا بارہ گئے بہت پیچھے
ہم آ گئے ہیں کہاں روشنی کا دم بھرتے

(بمبئی ۱۹۶۶ء)



ہر ایک پنکھڑی گُل کی ہے نوکِ خار مجھے
فریب دیتی ہے کیا فصلِ نو بہار مجھے

قریب آکے دلوں میں ہیں دُور یاں اب تک
نہ اعتبار اُنہیں ہے نہ اعتبار مجھے

کہاں خلاؤں میں گُم ہو گئی خدا جانے
وہ اک نگاہ کیا جس نے بیقرار مجھے

تڑپ تڑپ کے کیا دل نے عشق کو رُسوا
کہیں کا بھی تو نہ رکھا مآلِ کار مجھے

نظر کو دعوتِ جلوہ تو دے چکا ہے بہت
سما کے اب مرے دل میں کبھی پُکار مجھے

بڑھا تو لوں گُل و لالہ سے رسم و راہ بہت
فضا چمن کی کب آئے گی سازگار مجھے

اُسے کسی سے کہوں کس طرح گوارا ہو
ضیا جو بات گزرتی ہے ناگوار مجھے

(نئی دہلی نومبر ۱۹۸۰ء)



ہر چاکِ جگر فصلِ جوانی تو نہیں ہے
ہر زخم محبّت کی نشانی تو نہیں ہے
ٹوٹی ہوئی توبہ پہ پریشان ہے ناحق
بازار میں اس شئے کی گرانی تو نہیں ہے
رودادِ حوادث وہ ذرا غور سے سُن لیں
ہر چند کہیں اس کو کہانی تو نہیں ہے
ہو درد کسی دل میں بھر آتی ہے مری آنکھ
ہے خون مری رگ میں یہ پانی تو نہیں ہے
مر مر کے جئے جاتا ہوں اب جان لے دُنیا
فانی ہوں میں ہستی مری فانی تو نہیں ہے
جدّت کہ قدامت مجھے کیا فکر، مرا شعر
بیگانۂ مفہوم و معانی تو نہیں ہے
پاتے ہیں ضیا دادِ سخنور مگر اُن کی
قسمت میں مری سحر بیانی تو نہیں ہے

(نئی دہلی جنوری ۱۹۷۹ء)



ہر قدم، ہر موڑ پر اک تازہ دھوکا کھائے ہے
جب ہولکے جنگلوں میں آدمی کھو جائے ہے

میری کج فہمی تو دیکھو موت سے ڈرتا ہوں میں
یہ لباسِ نو عروسِ کہنہ کو پہنائے ہے

کائناتِ بیکراں کو کس طرح کر لے اسیر
وہ تخیل، جو فقط حدِ نظر تک جائے ہے

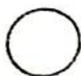
مانگ کر اس کو میں سمجھا تھا کہ سب کچھ مل گیا
تنگ دامانی پہ اب دل کس لئے شرمائے ہے

نام میں ایسی ہی شیرینی ہے جس کو زباں
بار بار دہرا چکی ہے، بارہا دہرائے ہے

ریگ زارِ زندگی میں دور تک سایہ نہیں
کیا مسافر اس جھلستی دھوپ میں سستائے ہے؟

اے ضیا کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھا یہ راز
ایک دن جانا بھی ہے اس کو یہاں جو آئے ہے

(نئی دہلی نومبر ۱۹۷۸ء)



یا ہواؤں کو ساحل نما کیجئے
یا کسی موج کو ناخدا کیجئے
ٹھوکریں کھائیے جب نہ پائیے وفا
کیا غمِ ناروا و روا کیجئے
رات تنہائی کی کاٹے کٹتی نہیں
وقت کو اور بھی تیز پا کیجئے
جاگتی صبح کی جگمگاتی کرن
رقص فرما ہوئی، آنکھ وا کیجئے
صبح کے شور میں شمع خاموش ہے
اپنی ہی آگ میں اب جلا کیجئے
عقل کی رہنمائی ہے لاحاصلی
لاکھ رہزن ہو دل کا کہا کیجئے
اپنے بیگانے ہو جائیں جب اے ضیا
دوستی کے لئے کیا دعا کیجئے

(نئی دہلی مارچ ۱۹۷۸ء)

ضیاؔ کی شاعری میں جان ہے، جذبہ ہے، رنگینی ہے اور ان عناصر میں تکمیل و ترقی کے ذی روح امکانات کارفرما ہیں۔

ساغرؔ نظامی

○

آپ کی غزلیں مجھے خاص طور سے پسند آئیں۔ غزل کا آرٹ بہت جان لیوا ہے۔ بغیر مسلسل ریاض اور خلوص فن کے غزل کہنا مشکل ہے۔ آپ کے ہاں دونوں کے نشان ملتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔

غلام ربانی تاباںؔ

○

آپ کی ادبی کاوشوں کا میں صرف قائل ہی نہیں رہا، ان کی روشنی میں اپنا ادبی سفر بھی طے کرتا رہا ہوں۔

ندآ فاضلی

○

شاعری کسی بھی زبان میں کی جائے وہ گہرے انسانی جذبات کی ترجمان بن جاتی ہے اُس میں فکر و نظر بھی شامل ہو جاتے ہیں تو اُس کی اہمیت آفاقی ہو جاتی ہے۔ ضیاؔ فتح آبادی لگ بھگ عرصہ پچاس سال سے انہی انسانی جذبات اور دانشورانہ فکر و نظر کے تجربات میں سے گزر رہے ہیں۔ مجھے اُن کی شاعری میں ایک ایسی گہرائی اور وسعت محسوس ہوتی ہے جو صرف سمندروں اور آسمانوں میں ہی مل سکتی ہے۔

رام لعل

○

آپ کا کلام فنی خوبیوں سے آراستہ ہے اور آپ کی پختہ کاری کا ایک واضح ثبوت ہے۔

ذہینؔ نقوی

○